جون ۹۶

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

- حیاتِ اقبال کا ایک گمشدہ ور

حافظ عاکف سعید کی خصوصی تح

- پاکستانی سیاست کا پہلا عوامی و ہنگامی دو

امیرِ تنظیمِ اسلامی کے ۱۹۷۰ء کے سیاسی تجز

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلا

قرآن کالج لاہور

بی۔اے (سال سوم) میں براہ راست داخلہ

اس سال انٹرمیڈیٹ کے نتائج کا اعلان ہونے سے قبل بی۔اے (سال سوم) میں براہ راست داخلہ کی سہولت فراہم کی گئی ہے' جس کی تفصیل درج ذیل ہے :

دیگر کالجوں سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان دینے والے طلبہ کے لئے' بی۔اے کی باقاعدہ تدریس کے آغاز (اکتوبر 96ء) سے پہلے' یکم جولائی 96ء سے ایک سہ ماہی تربیتی کورس کا انعقاد کیا جارہا ہے' بی اے میں داخلے کے خواہشمند طلبہ کے لئے اس کورس سے گزرنا لازم ہو گا۔ اس کورس کی کامیابی کے ساتھ تکمیل پر یہ طلبہ قرآن کالج سے انٹرمیڈیٹ کرنے والے طلبہ کے مساوی اہلیت حاصل کر کے ان کے ہمراہ بی۔اے کی تعلیم حاصل کریں گے۔ (واضح رہے کہ قرآن کالج میں عربی بطور اختیاری (Elective) مضمون اختیار کرنا ضروری ہے)۔

مذکورہ بالا سہ ماہی تربیتی کورس میں مندرجہ ذیل مضامین کی تعلیم دی جائے گی :

1۔ عربی گرائمر 2۔ انگریزی گرائمر 3۔ تجوید
4۔ قرآن مجید کا منتخب نصاب 5۔ مطالعہ دینی لٹریچر

درخواست دینے کی آخری تاریخ	27 جون 1996ء
انٹرویو کی تاریخ	30 جون 1996ء
تربیتی کورس کا آغاز	یکم جولائی 1996ء

المعلن : پرنسپل' قرآن کالج' لاہور

191۔ اتاترک بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن لاہور فون : 38۔5833637

زیر اہتمام : مرکزی انجمن خدام القرآن' لاہور

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد: ۴۵
شمارہ: ۶
محرم الحرام ۱۴۱۷ھ
جون ۱۹۹۶ء
فی شمارہ ۱۰/-
سالانہ زرتعاون ۱۰۰/-

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

ادارہ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک

- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر 10 امریکی ڈالر
- سعودی عرب، کویت، بحرین، عرب امارات قطر، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان 17 امریکی ڈالر
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ 22 امریکی ڈالر

توسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔ فون: 03-02-5869501
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون: 6305110
پبلشر: ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

☆ عرض احوال ۳

حافظ عاکف سعید

☆ تذکرہ و تبصرہ ۷

حیاتِ اقبال کا ایک گم شدہ ورق

حافظ عاکف سعید

☆ دعوت و تحریک ۲۹

انجمن کے بعد تنظیم کیوں؟

امیر تنظیم اسلامی کا ایک اہم مکتوب

☆ کتابیات ۳۵

نفاق کی نشانیاں (۴)

مترجم : ابوعبد الرحمٰن شبیر بن نور

☆ تازہ خواھی داشتن ۴۱

پاکستانی سیاست کا پہلا عوامی و ہنگامی دور (۲)

امیر تنظیم اسلامی کے ۱۹۷۰ء کے سیاسی تجزیے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرض احوال

ملک و قوم کی نیا الحاد اور سیکولرزم کی طوفانی موجوں کے رحم و کرم پر ہلاکت و تباہی کی منزل کی جانب تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ملک میں موجود مذہبی عناصر اور دینی سیاسی جماعتیں اس سیلابی دھارے کا رخ موڑنے میں قطعی طور پر ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ بعض سیاسی جماعتوں نے "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" کے اصول پر خود بھی موجودہ سیکولرزم نظام کے ساتھ سازگاری اختیار کر لی ہے اور اب ان کی حیثیت سیکولر قوتوں کے ہاتھوں میں ایک کھلونے سے زیادہ نہیں۔ دنیاداری کے اس کھیل میں وہ خود تو رسوا ہو ہی رہی ہیں' ان کے اس طرز عمل سے دین و مذہب کے حصے میں جو رسوائی آئی ہے وہ اس داستان کا سب سے زیادہ تلخ باب ہے اور اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ مادہ پرستی اور سیکولرزم کا زہر پورے جسد ملی میں سرایت کر چکا ہے۔ اس کے مظاہر آئے روز ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں' کبھی شراب کے لائسنسوں کے کھلے عام اجراء کی خبر ذہن و قلب پر برق بن کر گرتی ہے' تو کبھی اخبارات میں مختلف خبروں اور عدالتی کیسوں کے حوالے سے اسلامی نظام معاشرت کی دھجیاں بکھرتے دیکھ کر سانس رکنے لگتا ہے۔ دین و مذہب کی بنیادوں کو تاک تاک کر نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اسلامی اقدار کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا جا رہا اور یہ سب کچھ اتنی گہری منصوبہ بندی کے تحت ہو رہا ہے کہ حیرانی ہوتی ہے کہ جن نااہل ہاتھوں میں تقدیر حنا ٹھہری ہے ان میں اتنا سلیقہ کہاں سے آ گیا! ہمارے اس ملک میں سرکاری و اجتماعی سطح پر کوئی کام سلیقے اور نفاست سے نہیں ہوتا۔ کرپشن' بددیانتی اور نااہلی کا روگ مفاد عامہ کے ہر کام میں زہر گھول دیتا ہے۔ ہاں دین و مذہب کی جڑیں کھودنے اور فحاشی و عریانی کو فروغ دینے میں ہم نے بڑے بڑے ہنرمندوں کو خجالت و شرمندگی سے دوچار کیا ہے۔

ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ!!

ان حالات میں اصلاح احوال کی صرف اور صرف وہی ایک صورت ممکن ہے جس کی جانب قوم کو متوجہ کرتے اب ہمیں ربع صدی ہونے کو آئی ہے۔ لیکن من حیث القوم ہماری مادہ پرستانہ سوچ اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ہم اب تک دو مارشل لاؤں کا مزا چکھ چکے ہیں اور تیسرے کو خوش آمدید کہنے کے لئے آمادہ ہیں' ہم بدترین آمریت کا دور بھی دیکھ آئے ہیں' ہمیں نام نہاد جمہوریت کے ہاتھوں بھی گہرے چرکے لگ چکے ہیں' ہمیں یہ سب کچھ منظور ہے' لیکن نظام خلافت کے قیام اور اسلامی انقلاب کی راہ پر آنا کسی طور پر گوارا نہیں!!---- ان تجربات

سے کم از کم اتنا سبق تو ہمیں سیکھ ہی لینا چاہئے کہ ہمارے قومی و ملی دکھوں کا مداوا ہمارے ان خود ساختہ اور مغرب سے مستعار لئے ہوئے نظاموں میں سے کوئی نظام نہیں بن سکتا اور اب "ناچار مسلمان شو" کے مصداق ہمیں نظام خلافت کے دامن میں ہی پناہ لینی ہوگی۔ تاہم یہ امر واقعہ ہے کہ محض نیک تمناؤں اور خوش نما آرزوؤں کے ذریعے نظام خلافت قائم نہیں ہوگا' اس کے لئے ہمیں اسی طریق پر ایک بھرپور انقلابی جدوجہد کرنا ہوگی جس طریق کو اختیار کر کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے نظام باطل کو جڑ سے اکھاڑ کر دین حق کو قائم و غالب کیا تھا۔ اللھم وفقنا لھذا

☆ ☆ ☆

ملکی سیاسی صورتحال کے بارے میں امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے خیالات اور مختلف اہم قومی مسائل کے متعلق امیر تنظیم کے موقف سے قارئین کو آگاہ کرنے کے لئے حسب معمول ذیل میں امیر تنظیم کے خطابات جمعہ کے پریس ریلیز ہدیہ قارئین کئے جا رہے ہیں :

۱۷/ مئی ۹۶ء کے خطاب جمعہ کا پریس ریلیز

لاہور (پ ر) حکومت پنجاب کی جانب سے بڑے پیمانے پر شراب کے لائسنسوں کا اجراء کوئی بڑی گہری سازش معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح انسانی حقوق کی آڑ میں بالغ لڑکی کے بغیر ولی کے نکاح کر لینے کی پشت پناہی کی جا رہی ہے۔ یہ دراصل اسلام کے خاندانی نظام اور مشرقی اقدار کو تلپٹ کر دینے کی کوشش ہے۔ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں اپنے خطاب جمعہ میں کہا کہ توہین رسالت اور قادیانیوں سے متعلق قوانین کی منسوخی کے امریکی مطالبے کے جواب میں حکومت کی جانب سے دو تہائی اکثریت کے نہ ہونے کا جواز پیش کر کے معذرت خواہانہ رویئے کا اظہار قابل مذمت ہے۔ اس قسم کا طرز عمل ہماری حکومت کے عزائم کو ظاہر کرتا ہے جو وہ اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے اسلام کے خلاف کرنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے رول کی تعریف کی کہ دین کے ایک خاص پہلو کی حفاظت کے حوالے سے اس مجلس کی جدوجہد قابل فخر ہے۔

عمران خان کی تحریک انصاف کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ انہیں واضح کرنا چاہئے کہ ان کا "انصاف" کا تصور کیا ہے۔ انصاف کا ایک تصور وہ ہے جو اسلام ہمیں دیتا ہے اور اس کے بارے میں ایک تصور وہ ہے جو مغرب میں رائج ہے۔ عمران خان کا یہ کہنا ہے کہ وہ

سیاست میں اسلام کا نام استعمال کرنے کے قائل نہیں، لیکن اگر انہیں اسلام کا عادلانہ نظام لانا ہے تو انہیں اسلام کا نام لینا پڑے گا۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ لوگوں کے سامنے بھی آئے کہ جو لوگ اسلام کا نظام انصاف لانا چاہتے ہیں خود ان کی زندگیوں میں اسلام کس قدر ہے۔ قاضی حسین احمد بھی عمران خان کی تحریک انصاف سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، یہی وجہ ہے کہ اب انہوں نے شباب ملی کو از سر نو متحرک کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ یہ بات جماعت اسلامی کے ان لوگوں کے لئے لمحہ فکریہ ہے جو ایسے اصلاحی کاموں کے لئے جماعت اسلامی کے ہوتے ہوئے کوئی علیحدہ پلیٹ فارم بنانے کے قائل نہیں ہیں۔

۲۴/ مئی ۹۶ء کے خطاب جمعہ کا پریس ریلیز

لاہور (پ ر) ملک کی زمینوں کی شرعی حیثیت کے از سر نو تعین کے لئے اعلیٰ اختیاراتی لینڈ کمیشن قائم کیا جائے جس میں جید علماء اور بندوبست اراضی کے ماہرین شامل ہوں۔ پاکستان کے نظام میں جاگیرداری کی جڑیں بہت گہری اور مضبوط ہیں جس کو محض ملکیت زمین کی حدود متعین کرنے سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ملک کو جاگیرداری اور سرمایہ داری کی گرفت سے آزاد کرانے کے لئے خونی انقلاب کی ضرورت ہے۔ تاہم غیر مسلح بغاوت یا سول نافرمانی کی تحریک کے ذریعے بھی انقلاب لایا جا سکتا ہے جس میں جان لینے کی بجائے انقلابی اپنی جان کی بازی لگاتا ہے۔

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے نماز جمعہ سے قبل مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں "مسئلہ ملکیت زمین اور جاگیرداری اور وغیر حاضر زمینداری" کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ شریعت اپیلیٹ بینچ نے انفرادی ملکیت کو قومی ملکیت بنانے کے خلاف فیصلہ دے کر زرعی اصلاحات کا راستہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا ہے۔ چنانچہ اب زرعی اصلاحات کے ذریعے زمینداری کے موجودہ نظام کا خاتمہ ممکن نہیں رہا۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ عہد خلافت راشدہ کے بعد عرب ملوکیت کے دور میں زرعی زمین کی نوعیت و حیثیت میں بڑی تبدیلی کر دی گئی۔ چنانچہ نظریہ ضرورت کے تحت ریاست کی ملکیت "خراجی" زمین کو بیت المال سے نکال کر ذاتی ملکیت بنا کر "عشری" قرار دے دیا گیا۔ عشری اور خراجی زمین کے فرق کو واضح کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ خراجی زمین اسلامی ریاست کی ملکیت ہوتی ہے جس کی پیداوار میں سے حکومت براہ راست کاشتکار سے خراج وصول کرتی ہے اور حکومت اور کاشتکار کے مابین کوئی جاگیردار یا غیر حاضر زمیندار حائل نہیں ہوتا۔ جب کہ انفرادی ملکیتی زمین عشری کہلاتی ہے جس کی پیداوار میں سے عشر وصول کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے ملکیت زمین کے تصور کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اسلام کی رو سے کسی شخص کو کسی شے پر مطلق ملکیت کا اختیار حاصل نہیں' اس لئے کہ کائنات کی ہر شے اللہ کی ملکیت ہے۔ تاہم اسلام انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کرتے ہوئے انسانوں کو حصول رزق کے لئے تصرف و استفادہ کا حق دیتا ہے۔ انسان سمیت تمام جاندار مخلوق کا رزق چونکہ زمین ہی سے حاصل ہوتا ہے اس لئے دیگر اشیاء کی ملکیت اور زمین کی ملکیت میں بنیادی فرق ہے۔ انہوں نے کہا اسلام کی رو سے مسلسل تین سال تک زمین کو کاشت نہ کرنے والے کا حق تصرف ختم ہو جاتا ہے۔

امیر تنظیم اسلامی نے شاہ ولی اللہ دہلوی کے حوالے سے کہا کہ انہوں نے ایک حدیث نبویؐ سے استدلال کرتے ہوئے اپنی مشہور کتاب "حجتہ اللہ البالغہ" میں زمین کو "مسجد اور سرائے" کی طرح سب لوگوں کے لئے "وقف" قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا عہد فاروقیؓ میں ہونے والے "اجماع" کے ذریعے مفتوحہ زمینوں کو "مال فے" قرار دے کر جاگیرداری نظام کا راستہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا تھا۔ انہوں نے کہا برعظیم پاک و ہند کی تمام اراضی چونکہ مجاہدین اسلام نے بزور شمشیر فتح کی تھی لہٰذا حضرت عمرؓ کے فیصلے کے مطابق یہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ عوام کی اجتماعی ملکیت اور اسلامی ریاست کی جاگیر ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا جاگیرداروں اور غیر حاضر زمینداروں کا موجودہ طبقہ انگریز کے دور کی پیداوار ہے۔ اس دور میں شیخ جلال الدین تھانیسری اور بعد ازاں شاہ عبدالعزیز دہلوی' قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور دیگر علماء نے برعظیم کی زمینوں کو واضح طور پر خراجی یعنی ریاست کی ملکیت قرار دیا تھا۔ لیکن پاکستان بن جانے کے بعد ایک ہی نام سے دو کتابیں ایسی آئیں جن میں مزارعت کے جواز کا فتویٰ دیا گیا تھا۔ ایک کتاب کے مصنف مولانا مودودی مرحوم اور دوسری کا مصنف مرزا بشیر الدین محمود تھا۔ قادیانی گروہ کے اکابرین نے سندھ اور بلوچستان میں قادیانی ریاست کے قیام کے لئے وہاں کے جاگیرداروں کو قادیانی بنانے کے ارادے سے مزارعت کو جائز قرار دیا تھا' حالانکہ چاروں فقہاء کے نزدیک مزارعت حرام ہے اور زمین کو ٹھیکے پر دینے اور بٹائی پر دینے کی اسلام میں قطعاً گنجائش نہیں۔ مزارعت بھی درحقیقت سود ہی کی ایک شکل ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلام ذرائع پیداوار کی منصفانہ تقسیم چاہتا ہے۔ اسلام کا اصل الاصول ہے "ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ سرمایہ تمہارے دولت مندوں کے مابین ہی گردش کرتا رہے"۔ اسلامی معاشرے میں ہر شخص کی بنیادی ضروریات پوری ہونی چاہئیں۔

تذکرہ وتبصرہ

عاکف سعید

حیاتِ اقبال کا ایک گم شدہ ورق

امارت اور بیعت کی اساس پر خالص دینی تنظیم کے قیام کی کوشش

علامہ اقبال کے بارے میں یہ بات سب جانتے ہیں کہ وہ ایک عظیم قومی و ملی شاعر اور بلند پایہ فلسفی و حکیم ہی نہیں تھے، مفکر و مصورِ پاکستان بھی تھے۔ وہ برِ عظیم پاک و ہند میں بسنے والے مسلمانوں کو انگریز کی غلامی اور ہندو کے تسلّط سے نجات دلانے اور سیاسی و معاشی میدان میں ان کے بہتر مستقبل کے بارے میں ہی فکر مند نہیں رہتے تھے، امتِ مسلمہ کی عظمت و سطوتِ گزشتہ کی بازیافت اور احیاء اسلام کے شدت کے ساتھ آرزومند بھی تھے۔

علامہ کے بارے میں یہ بات بھی کسی سے مخفی نہیں کہ علامہ نے پاکستان کا محض تصور اور تخیل ہی پیش نہیں کیا، پاکستان کے قیام کا مطالبہ لے کر اٹھنے والی مسلمانوں کی نمائندہ سیاسی جماعت، مسلم لیگ میں باقاعدہ شمولیت اختیار کی اور ایک فعال کارکن اور ایک صاحبِ فہم اور مدبّر رہنما کے طور پر مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں کی آزادی کی جنگ میں بھرپور حصہ لیا۔ علامہ کی حیات کا یہ گوشہ ایک کھلی کتاب کی مانند ہے۔ لیکن یہ بات بہت ہی کم لوگوں کے علم میں ہو گی کہ اپنی حیاتِ دنیوی کے آخری حصے میں حضرت علامہ "مسلمانوں کے عروج و اقبال" اور "اعلاءِ کلمۃ اللہ" کی خاطر خالص اسلامی اصولوں یعنی بیعت کی بنیاد پر قائم ہونے والی ایک ایسی انقلابی جماعت کی تشکیل کی سرتوڑ کوشش بھی کرتے رہے جو محض نام کے مسلمانوں پر نہیں بلکہ "فداکاروں" پر مشتمل ہو۔ علامہ اپنی کوشش میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے لیکن تشکیلِ جماعت کے بالکل آخری مرحلے پر

پہنچ کر بعض وجوہات کی بنا پر جن کا ذکر آگے قدرے تفصیل سے آئے گا، یہ معاملہ رک گیا اور یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ حیاتِ اقبال کا یہ گم شدہ اور فراموش کردہ ورق حال ہی میں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مرحوم کی ایک کتاب "علامہ اقبال اور مسلمانوں کا سیاسی نصب العین" کے ذریعے منظر عام پر آیا ہے۔ اس اہم تاریخی دستاویز کو آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس نے دسمبر ۱۹۹۴ء میں، یعنی ڈاکٹر فاروقی مرحوم کے انتقال سے چند ماہ قبل شائع کیا۔ ہمارا احساس ہے کہ حیاتِ اقبال کے اس اہم گوشے کی نقاب کشائی کر کے ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے ملّتِ اسلامیہ پاکستان پر احسان عظیم کیا ہے، ورنہ ان کے سینے میں محفوظ یہ بیش قیمت تاریخی امانت ان کے ساتھ ہی قبر میں اتر جاتی اور حیات قبال کا یہ گوشہ ہمیشہ کے لئے تاریخ کے دھندلکوں میں گم ہو جاتا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی قبر کو نور سے بھر دے اور انہیں اپنے دامنِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے (آمین)۔

☆ ☆ ☆

اس اجمال کی تفصیل جاننے کے لئے بطور تمہید ہمیں علامہ اقبال کے خطبہ الٰہ آباد کی جانب رجوع کرنا ہو گا جو بلاشبہ مسلمانانِ ہند کی سیاسی اور اجتماعی زندگی میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں علامہ اقبال نے جو تاریخی خطبۂ صدارت پیش فرمایا اس میں جہاں اس نکتے کو خصوصی طور پر اجاگر کیا کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان ہر اعتبار سے ہندو کے مقابلے میں ایک جداگانہ قوم ہیں اور ان کی قومیت کی واحد بنیاد اسلام ہے، وہیں ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ مملکت کے قیام کا خیال بلکہ مطالبہ بھی پہلی بار وضاحت کے ساتھ پیش کیا، جس کے لئے اپنے خطبے میں علامہ نے "ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند" کے الفاظ استعمال کئے۔ حضرت علامہ کے خطبہ الٰہ آباد کے درج ذیل اقتباسات نوٹ کرنے کے لائق ہیں :

"کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں لیکن اس

کے نظامِ سیاست کے بجائے ان قومی نظاموں کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ اسلام کا مذہبی نصب العین، اس کے معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے، الگ نہیں ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کو ترک کرنا بھی لازم آئے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کے لئے بھی کسی ایسے نظام سیاست پر غور کرنے پر آمادہ نہ ہو گا جو اسلام کے اصول اتحاد کی نفی کرنے پر مبنی ہو . . . . . "

ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک الگ خطۂ زمین کے مطالبے کا جواز علامہ نے اپنے خطبے میں بایں الفاظ پیش فرمایا :

"... مغربی ممالک کی طرح ہندوستان کی یہ حالت نہیں کہ اس میں ایک ہی قوم آباد ہو، وہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہو اور اس کی زبان بھی ایک ہو۔ ہندوستان مختلف اقوام کا وطن ہے، جن کی نسل، زبان، مذہب سب ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ان کے اعمال و افعال میں وہ احساس پیدا ہی نہیں ہو سکتا جو ایک ہی نسل کے مختلف افراد میں موجود رہتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ہندو بھی تو کوئی واحد الجنس قوم نہیں۔ پس یہ امر کسی طرح بھی مناسب نہیں کہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کئے بغیر ہندوستان میں مغربی اصول جمہوریت پر عمل کرنا شروع کر دیا جائے۔ مسلمانوں کا مطالبہ بالکل بجا ہے کہ وہ ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کریں....."

مسلمانوں کے لئے ایک الگ خطے کے مطالبے کی ضرورت و اہمیت کو بیان کرتے ہوئے اسی خطبے میں ذرا آگے چل کر علامہ فرماتے ہیں :

"ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے...."

اس خطبے کے درج ذیل الفاظ ہمارے نقطۂ نگاہ سے خصوصی طور پر اہمیت کے حامل ہیں :

"میں صرف ہندوستان اور اسلام کے فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازنِ قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عرب ملوکیت کی وجہ سے اس پر اب تک قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گی"۔

گویا علامہ، مسلمانانِ ہند کے بہتر مستقبل کی خاطر محض ایک علیحدہ خطۂ زمین کے حصول ہی کے خواہاں نہیں تھے، بلکہ وہ "احیاءِ اسلام" کے بھی شدت کے ساتھ آرزومند تھے اور اس مجوزہ خطۂ زمین میں اسلام کو محض ایک مذہب کے طور پر نہیں بلکہ ایک زندہ اور غالب سیاسی و معاشرتی قوت کی حیثیت سے سربلند کرنا چاہتے تھے۔ علامہ کو اس امر کا پورا شعور و ادراک حاصل تھا کہ دینِ اسلام اپنی اصل شکل اور کامل صورت میں صرف دورِ خلافتِ راشدہ تک قائم رہا۔ خلافت کے ملوکیت میں تبدیل ہوتے ہی اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کے حسین نقوش دھندلانے لگے اور اسلام کے رخِ روشن کی تابناکی ماند پڑنے لگی۔ دورِ ملوکیت میں مدون ہونے والی فقہ بھی ملوکیت کے اثرات سے بالکلیہ پاک نہ تھی۔ نظامِ اجتماعی کے بعض اہم گوشوں میں مسلم فقہاء نے "نظریۂ ضرورت" کے تحت بعض ایسے فتوے دیئے جو ملوکیت اور جاگیرداری نظام کے تحفظ و بقا کا ذریعہ بنے۔

اپنے اس خطبے میں اقبال دو اعتبارات سے نہایت پرامید نظر آتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقے میں مسلمانوں کی ایک آزاد ریاست کا قائم ہو جانا یقینی نہیں ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مسلمانانِ ہند کی نمائندگی کرتے ہوئے انہوں نے اپنے اس خطبے میں مسلمانوں کے لئے ایک آزاد ریاست کا پرزور مطالبہ کرنے اور اس کے حق میں مضبوط عقلی دلائل پیش کرنے پر ہی اکتفا نہیں کی، ایک وژنری (VISIONRY) کی حیثیت سے قیامِ پاکستان کو ایک یقینی امر اور تقدیرِ مبرم بھی قرار دیا ہے۔ خطبہ الٰہ آباد میں شامل ان کے یہ تاریخی الفاظ خصوصیت کے ساتھ نوٹ کرنے کے

قابل ہیں : "میں محسوس کرتا ہوں کہ ہندوستان کے شمال مغربی خطے میں ایک آزاد مسلم ریاست کا قیام ایک ایسی تقدیر ہے جسے ٹالا نہیں جا سکتا"[1]------اسی طرح وہ اس بارے میں بھی بہت پر امید نظر آتے ہیں کہ مسلمانوں کی ایک علیحدہ آزاد ریاست کے نتیجے میں احیاء اسلام کے دیرینہ خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے کا سامان فراہم ہو جائے گا۔ پھر ہمارے لئے اس بات کا موقع ہو گا کہ دورِ خلافتِ راشدہ کے بعد گویا قریباً ساڑھے تیرہ صدیوں کے وقفے کے بعد ایک بار پھر اسلامی تعلیمات کا صحیح نمونہ اور اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کی سچی تصویر عملاً دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ اس طرح پاکستان کا قیام عالمی سطح پر اسلام کے غلبۂ ثانی کی تمہید بن جائے گا۔ اقبال کے یہ مشہور اشعار اسی رجائیت کا مظہر ہیں :

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

اور

کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

اور

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

☆ ☆ ☆

خطبہ الٰہ آباد کے ان انقلاب آفریں افکار کا فوری نتیجہ علی گڑھ میں ظاہر ہوا۔ یوں بھی الٰہ آباد اور علی گڑھ مکانی طور پر ایک دوسرے سے بہت قرب رکھتے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے صدر شعبۂ فلسفہ ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب نے جن کے علم و فضل کی دھاک ایک زمانے تک رہی، علامہ کے اس خطبے سے متاثر ہو کر جماعتِ مجاہدین علی

---

[1] علامہ کے انہی الفاظ کو بنیاد بناتے ہوئے امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے گزشتہ ماہ، ۲۶/ اپریل ۹۶ء کو یوم اقبال کے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے علامہ اقبال کو پہلی بار "مبشر پاکستان" کا خطاب دیا جسے علمی حلقوں میں بہت سراہا گیا۔

گڑھ کے نام سے ٹھیٹھ اسلامی اصولوں پر مبنی ایک جماعت کی تشکیل کا جامع منصوبہ تیار کیا، تاکہ علامہ کے تجویز کردہ نصب العین کے حصول کے لئے منظم جدوجہد کی جاسکے۔ اس کے ابتدائی قدم کے طور پر انہوں نے ایک جامع دستاویز تیار کی جس میں جماعت مجاہدین کے قیام کی غرض وغایت سے لے کر اس کے تنظیمی ڈھانچے تک تمام تفصیلات شامل تھیں۔ (اس دستاویز کا مکمل متن ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی کتاب میں درج ہے) اس دستاویز کا پہلا حصہ دراصل علامہ کے خطبہ الٰہ آبادی کی مزید تشریح وتوضیح پر مشتمل تھا جس میں مسلمانانِ ہند کی حالت زار کا ایک نقشہ کھینچنے کے بعد سب سے زیادہ زور اس نکتے پر دیا گیا کہ ہندو اور مسلمان ہرگز ایک قوم نہیں بلکہ یہ دو علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں، جو ہر اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد رجحانات کی حامل ہیں۔ اس دستاویز کے ابتدائی حصے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو!

> "مسلمانو! یہ ایک سراب ہے کہ ہندو اور مسلمان مل کر رہیں گے یا ہندوستان ایک نیشن یعنی قوم ہے یا ہو جائے گا۔ مسلمان بالیقین ایک علیحدہ قوم ہیں اور ہندو ایک علیحدہ قوم۔ جو چیزیں گروہ کو ایک قوم بناتی ہیں ان میں سے کوئی چیز ہندوؤں اور مسلمانوں میں مشترک نہیں۔ مسلمانوں کے عقائد واخلاق جدا ہیں، ہندوؤں کے جدا۔ مسلمانوں کے اقدار وعادات، رسم ورواج، طرز ماندوبود جدا ہیں، ہندوؤں کے جدا۔ مسلمانوں کا قانون جدا ہے، ہندوؤں کا جدا۔ مسلمانوں کی تاریخ جدا ہے، ہندوؤں کی جدا۔ مسلمانوں کی امنگیں جدا ہیں اور ہندوؤں کی جدا۔ مسلمانوں کو اصول قومیت جدا ہے، ہندوؤں کا جدا۔ مسلمانوں کا خدا اور ہے، ہندوؤں کا اور"۔

مسلمان قوم کو اس گرداب سے کیسے نکالا جائے؟ انہیں انگریز کی غلامی اور ہندو کے تسلط سے کیسے نجات دلائی جائے؟ ملت اسلامیہ ہند کے تن مردہ میں نئی روح کیونکر پھونکی جائے؟ اس دستاویز کے دوسرے حصے میں ان اہم سوالات پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر سید ظفرالحسن اس کا حل یہ تجویز کرتے ہیں کہ مسلمان قوم کو اگر کسی بلند مقصد سے آشنا کر دیا جائے اور اسے ایک نظم کے تحت منظم کر دیا جائے تو صورتحال بدل سکتی ہے۔ دلچسپ بات

یہ ہے کہ انہوں نے نظمِ جماعت کے سلسلے میں جمہوریت یا جمہوری اصولوں کو سرے سے درخورِ اعتناء نہ سمجھا بلکہ صاف الفاظ میں تسلیم کیا کہ :

"مسلمانوں کو منظم کرنے کا وہی ایک صحیح اصول ہے جس پر اسلام آغاز میں منظم ہوا تھا۔ جس کی صورت موجودہ حالات کو مدنظر رکھ کر آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ مسلمانوں کا ایک امیر ہونا چاہئے اور ان کی ایک مجلس شوریٰ ہونی چاہئے اور قوم کو پابند ہونا چاہئے امیر کے احکام کا"۔

جماعت کے نظم یا مسلمانوں کی تنظیم کی مزید وضاحت اس دستاویز میں بایں الفاظ کی گئی :

"جماعت کی تنظیم میں سب سے اہم چیز امیر ہے۔ ایک طرف تو یہ ضروری ہے کہ امیر کو اختیاراتِ کلی ہوں، اور دوسری طرف یہ کہ وہ مطلق العنان نہ ہو جائے۔ زمانہ حال کی جمہوریت غلط ثابت ہو چکی ہے۔ اس کے مصائب سے عالم لبریز ہے۔ پس شورائیت پر نظر ڈالنی چاہئے۔ اسلامی جمہوریت کے دو اصول معلوم ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ امیر جمہور کے اتفاق رائے سے امیر ہو اور رہے۔ یعنی اس کا عزل و نصب جمہور کی رائے پر مبنی ہو۔ دوسرے یہ کہ امیر عمر بھر کے لئے اور اس کا اقتدار کلی ہو اور جمہور اس کی رائے اور احکام سے انکار نہ کر سکیں"۔

امیر کو مجلس شوریٰ کی اکثریت کے فیصلے کا پابند ہونا چاہئے یا اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ مجلس شوریٰ کی تحریکوں یا فیصلوں کو برطرف کر سکے، اس اہم مسئلے میں ڈاکٹر سید ظفر الحسن کا ذہن بالکل واضح تھا۔ واضح رہے کہ ان کی پرورش بسم اللہ کے گنبد میں نہیں ہوئی تھی بلکہ علامہ اقبال کی طرح وہ بھی "عذابِ دانشِ حاضر" سے خوب اچھی طرح باخبر تھے اور علامہ ہی کی طرح انہیں بھی یہ اعزاز حاصل تھا کہ وہ بھی "کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل" کا مصداق ثابت ہوئے۔ گویا ساری زندگی خرد کی گتھیاں سلجھانے اور عقل و منطق کے بحر میں شناوری کے باوجود وہ ہمارے دور کے دانشوروں کی مانند عقل گزیدہ نہیں تھے بلکہ اسلام کے نظم جماعت کی روح کو سمجھتے اور امارت کے تقاضوں کا پورا ادراک رکھتے تھے۔ چنانچہ امیر اور مجلس شوریٰ کے اختیارات پر گفتگو کرتے ہوئے وہ دوٹوک انداز میں لکھتے ہیں :

"پس ہمیں امیر کو اختیاراتِ کلی دینے چاہئیں۔ مجلس شوریٰ کا کام فقط مشورہ دینا ہو گا نہ کہ کثرت رائے سے امیر کے خلاف مسائل طے کرنا۔ لیکن مجلس شوریٰ کو اختیار ہو گا کہ اگر وہ امیر کو نااہل سمجھے تو برطرف کر سکے۔

ان سب پہلوؤں پر نظر رکھ کر یہ کرنا چاہئے کہ امیر کو اختیار دیا جائے کہ مجلس شوریٰ کی تمام تحریکوں اور فیصلوں کو برطرف کر سکے' الا یہ کہ وہ تحریک جو امیر کے عزل کے لئے ہو"۔

چنانچہ اس دستاویز میں یہ طے کیا گیا کہ یہ جماعت بیعت کی بنیاد پر قائم ہو گی۔ اس کے ارکان امیر کے ہاتھ پر بیعت کے ذریعے جماعت میں شامل ہوں گے۔ جماعت کا مقصدِ تاسیس "ہندوستان کے مسلمانوں کا عروج و اقبال" قرار پایا اور یہ بھی طے کیا گیا کہ ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب اس جماعت کے پہلے امیر ہوں گے۔ مزید برآں جماعتِ مجاہدین کے تاسیسی ارکان کے طور پر درج ذیل افراد کا نام درج کیا گیا اور ان کے بارے میں یہ صراحت بھی کی گئی کہ مجلس شوریٰ ان ہی افراد پر مشتمل ہو گی :

- افضال حسین قادری صاحب
- برہان احمد فاروقی صاحب[۲]
- محمد محمود احمد صاحب
- چودھری عبد الحمید صاحب
- محمد شفیع صاحب
- عمر الدین صاحب
- یعقوب بیگ نامی صاحب
- حکیم عبد اللطیف صاحب
- حکیم ظہیر الدین خاں صاحب
- سید عبد المجید صاحب

☆ ☆ ☆

اس بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے کہ اس دستاویز کی تیاری میں علامہ اقبال کا مشورہ بھی شامل تھا یا نہیں' تاہم یہ امر واقعہ ہے کہ ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر سید ظفر الحسن

۲۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مرحوم جن کے ذریعے یہ تمام معلومات ہم تک پہنچیں' جماعت مجاہدین علی گڑھ کے تاسیسی ارکان میں سے تھے۔ بقیہ ارکان میں سے مکتبہ کاروان والے چوہدری عبد الحمید صاحب ابھی بحمد اللہ بقید حیات ہیں' باقی افراد کے بارے میں نہیں معلوم کہ کس حال میں ہیں۔

صاحب نے گرمیوں کی تعطیلات میں علی گڑھ سے کشمیر جاتے ہوئے لاہور میں اپنے مختصر قیام کے دوران علامہ اقبال سے بالمشافہ اس دستاویز پر تفصیلی گفتگو فرمائی۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے اس ملاقات کا ذکر اپنی کتاب میں بایں الفاظ کیا ہے :

"یہ دستاویز جس میں علامہ اقبال کے الٰہ آباد کے خطبہ صدارت میں مجوزہ نصب العین کی وضاحت کی گئی تھی' مرتب ہو گئی تو حضرت استاذی ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب نے ۳۲ء کی گرمیوں کی تعطیل کے دوران علی گڑھ سے کشمیر جاتے ہوئے لاہور میں رک کر علامہ اقبال سے بالمشافہ تفصیلی گفتگو فرمائی اور اس خیال کو عملی صورت دینے کے لئے غور و خوض اور طریق کار متعین کرنے کے لئے مشورہ طلب فرمایا اور طے پایا کہ اس باب میں کچھ جد و جہد شروع کی جائے"۔

اس ملاقات کے بعد علامہ اور ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب کے مابین اس بات کو آگے بڑھانے اور دوسرے اہم لوگوں کو ہم خیال بنانے کے ضمن میں خط و کتابت کے ایک طویل سلسلے کا آغاز ہو گیا۔ سب سے پہلا خط جو علامہ نے اس سلسلے میں ڈاکٹر سید ظفر الحسن کو لکھا وہ ۲/ اگست ۱۹۳۲ء کا تحریر کردہ ہے۔ اس خط میں علامہ نے نہ صرف ڈاکٹر سید ظفر الحسن کے تجویز کردہ خاکے کی مکمل تصویب کی بلکہ اس کی تائید میں اپنے ایک ۲۵ سال پرانے کشف یا روحانی واردات کا ذکر بھی کیا جس کا تجربہ علامہ کو دو مختلف مواقع پر ہوا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کی سربلندی کے لئے بیعت اور امارت کے اصولوں پر جماعت بنانے کی ضرورت و اہمیت کا احساس علامہ کو بہت پہلے سے تھا لیکن خود علامہ کے بقول کچھ اس بنا پر کہ "قابل اعتماد دوست مفقود ہیں" اور کچھ اس بنا پر کہ وہ خود اپنے اندر اس کے "مؤثر طریق" کی ہمت نہیں پاتے' اس سمت میں اب تک خود کوئی پیش رفت نہیں کر سکے تھے۔ خط کا متن ملاحظہ ہو!

"لاہور۔ ۶ اگست ۳۲ء　　پرائیویٹ اینڈ کانفیڈنشیل

ڈیئر سید ظفر الحسن صاحب!

آپ کا خط ابھی ملا ہے' الحمدللہ کہ آپ خیریت سے ہیں۔ اس بات کا احساس اب بہت سے لوگوں کو ہو گیا ہے۔ مجھے پچیس سال ہوئے جب اس کا احساس ایک

عجیب و غریب طریق میں ہوا۔ اس وقت میں انگلینڈ میں تھا۔ اس کے بعد ہندوستان میں اس کا اعادہ ہوا۔ اس کو اب کئی سال گزر چکے۔ جو طریق آپ نے بتایا ہے اس پر ایک دفعہ ایک خاص طرح پر عمل بھی ہوا۔ اور اس کو ایک متعین صورت بھی دی گئی۔ مگر جلد معلوم ہوا کہ قبل از وقت ہے۔ زیادہ تر اس وجہ سے کہ قابل اعتماد دوست مفقود ہیں۔ میں آپ کو تفصیلات بتاؤں تو آپ حیران رہ جائیں۔ یہاں کے طبائع کی رو سے ایک ہی طریق مؤثر ہو سکتا ہے لیکن میں اس کے لئے اپنے آپ کو موزوں نہیں پاتا۔ یا یوں کہئے کہ اپنے میں اس قسم کی جرأت نہیں دیکھتا۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ آپ کب واپس آئیں گے۔ زبانی گفتگو سے معاملہ بخوبی طے ہو سکتا ہے۔ جن صاحب کو آپ بھیجیں ان پر پورا اعتماد ہونا چاہئے۔ مجھ کو کسی قدر تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ایسا لکھنے پر مجبور ہوا۔

آج شام دہلی جا رہا ہوں کیونکہ کل وہاں مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہے۔ ان شاء اللہ سوموار کی صبح کو واپس آؤں گا۔ مخلص محمد اقبال"

اس خط کے بعض مندرجات کی تشریح کرتے ہوئے ڈاکٹر برہان احمد فاروقی لکھتے ہیں :

"انگلینڈ کے دوران قیام میں اور ہندوستان واپس آنے کے بعد عجیب و غریب طریق پر جو احساس ہوا وہ اس مقصد کے لئے جدوجہد کرنے سے متعلق کسی وجدانی واردات کی طرف اشارہ ہے۔

خاص طرز پر عمل کرنے سے مراد اس خیال کو کوئی منظم صورت دینے کی کوشش ہے جسے لوگوں کے ناقابل اعتماد ہونے کی بناء پر قبل از وقت سمجھ کر ملتوی کرنا بہتر سمجھا گیا۔

جس طریق کار کے مؤثر ہو سکنے کی طرف اشارہ ہے وہ مذہبی روحانی پہلو کو مدنظر رکھ کر تحریک کی ابتداء کرنا ہے"۔

علامہ کے خط کے بین السطور سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ علامہ اس اسکیم کے معاملے میں رازداری چاہتے تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ یہ منصوبہ اگر طشت از بام ہو گیا تو ابتدائی مرحلے پر ہی اس کی بساط لپیٹ دینی پڑے گی۔ انہیں خوب اندازہ تھا کہ ان کی انقلاب آفرین ملی شاعری کے باعث انگریز ان سے خدشہ محسوس کرتا ہے اور ان کے اپنے

قریبی ساتھیوں کے ذریعے سے ان کی نگرانی کرائی جاتی ہے۔ چنانچہ احتیاط کے پیش نظر اس خط میں انہوں نے محض اشاروں کنایوں پر ہی اکتفا کی ہے۔

اس کے بعد چند ماہ کے اندر اندر علامہ اقبال نے ڈاکٹر سید ظفر الحسن کو یکے بعد دیگرے کئی خطوط لکھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اس جماعت کی تشکیل اور اس معاملے کو آگے بڑھانے میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے تھے اور ان کا ذہن اس مسئلے پر غور و خوض سے کبھی فارغ نہ ہوا تھا۔ ۳۰/ دسمبر ۳۲ء کو جو خط ڈاکٹر ظفر الحسن کو موصول ہوا اس کی نقل درج ذیل ہے :

"لاہور۔ ۳۰ دسمبر ۳۲ء

ڈیئر ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم! جس تجویز پر ہم نے لاہور میں گفتگو کی تھی اس کو مہر صاحب ایڈیٹر انقلاب نے بہت پسند کیا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ وہ ایسے لوگوں کی فہرست تیار کروائیں گے جن کو اس سے اتفاق ہو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اور لوگ بھی تیار ہیں۔

امید ہے آپ نے بھی اپنے احباب سے گفتگو کی ہوگی۔ نتیجہ سے مجھے وقتاً فوقتاً اطلاع دیتے رہئے۔

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

محمد اقبال"

ٹھیک تین ماہ بعد علامہ کی طرف سے ایک اور خط ڈاکٹر سید ظفر الحسن کے نام موصول ہوا۔ اس دوران علامہ اقبال نے اس ضمن میں ایک اور نامور علمی شخصیت ڈاکٹر عبدالجبار خیری سے جو خود ڈاکٹر ظفر الحسن کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے' متعدد ملاقاتیں کیں اور ان سے اس خاص موضوع پر مفصل گفتگو کی (واضح رہے کہ بعد میں ڈاکٹر عبدالجبار خیری کا مولانا مودودی مرحوم سے بھی قریبی رابطہ رہا' اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت الہیہ کے قیام کے لئے جماعت اسلامی کا خاکہ مرتب ہونے میں خیری صاحب کے اثرات کو عمل دخل حاصل تھا)

"لاہور۔۶ مارچ ۳۳ء

ڈیئر ظفر الحسن

آپ کا خط مجھے آج صبح دہلی سے واپس آنے پر ملا۔ الحمدللہ کہ آپ خیریت سے ہیں۔ میں نے دہلی میں سنا تھا کہ سید راس مسعود وہاں ہیں' مگر وقت نہ تھا کہ ان سے مل سکوں۔ افغانستان میں اس وقت حالات اچھے نہیں تھے۔ تاہم وہاں سے جب اطلاع آئے گی عرض کروں گا۔ بمبئی میں ان کے قونصل سردار صلاح الدین سلجوقی سے بھی گفتگو ہوئی تھی۔ وہ شاید اس سے پہلے بلاتے مگر میں ہندوستان میں نہ تھا۔

انگلستان جانے سے پہلے میں نے آپ کو اس تحریک کے متعلق لکھا تھا جس کا ذکر یہاں لاہور میں ہوا تھا۔ کہئے آپ کے مولوی عبدالجبار صاحب کے حالات کیا ہیں۔ اگر آپ صاحبان نے اس پر مزید غور کیا ہو تو مطلع فرمایئے۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ سید راس مسعود صاحب کی خدمت میں سلام عرض کیجئے۔

محمد اقبال لاہور"

صرف ۱۳ دن کے وقفے کے بعد علامہ نے ڈاکٹر سید ظفر الحسن کو ایک اور خط ارسال کیا۔ اس خط میں علامہ مجوزہ جماعت کے بارے میں بھی پر امید نظر آتے ہیں اور عالم اسلام کے مستقبل کے بارے میں بھی۔ خط کی عبارت ملاحظہ ہو!

"۱۹/ مارچ ۳۳ء

ڈیئر ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم!

آپ کا خط مل گیا ہے جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ میں نے افغانستان پیغام بھیج دیا ہے' جواب آنے پر مطلع کروں گا۔ میرے خیال میں وہ تجویز نہایت اچھی تھی اور اس قابل ہے کہ اسے جامہ عمل پہنایا جائے۔ خیری صاحب مجھ سے دہلی میں ملے تھے۔ معلوم ہوتا ہے وہ اس تجویز کو فراموش کر چکے ہیں۔ مگر میرا عقیدہ ہے کہ ایک اچھی جماعت اس کے لئے تیار ہے۔

ممالک اسلام میں بیداری کی لہر دوڑ رہی ہے، خصوصاً ممالک عرب میں۔ یورپ میں باوجود سیاسی انہماک کے اسلام کے متعلق بے انتہا دلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔ ہسپانیہ کے عربی الاصل لوگوں میں ایک نیا قومی شعور پیدا ہو رہا ہے۔ وسطی یورپ میں اسلام کے متعلق بے انتہا دلچسپی بالخصوص بڑھ رہی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اسلام کا اصل کام یعنی مشرق و مغرب کا انہی ممالک سے شروع ہو گا۔ افسوس میرے پاس روپیہ نہ تھا ورنہ ان ممالک کا سفر بھی کرتا۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

مخلص محمد اقبال"

اس کے قریباً دو ماہ بعد ۲۷/ مئی کو علامہ اقبال کو ڈاکٹر سید ظفر الحسن کی جانب سے ایک مفصل خط موصول ہوتا ہے جس میں اس اسکیم کو فوری طور پر عملی جامہ پہنانے کے ضمن میں ایک معین تجویز کا بھی ذکر ہے اور جماعت کی تنظیمی ہیئت سے متعلق بعض مزید تفاصیل بھی مذکور ہیں۔ اسی طرح ابتدائی نقشہ کار کا ایک اجمالی خاکہ بھی اس خط کے ذریعے سامنے آتا ہے۔ خط کے ساتھ ایک الگ کاغذ پر اس حلف یا بیعت کے الفاظ بھی علامہ کے ملاحظے اور مشورے کے لئے درج کئے گئے تھے جو امیر ہر رکن سے لے گا۔ اس اہم خط کا متن حسب ذیل ہے :

"۲۷/ مئی ۳۳ء

بخدمت ڈاکٹر سر محمد اقبال

محترم تسلیم!

میں اسی خیال میں اب بھی غلطاں و پیچاں ہوں جس کی گفتگو سال گزشتہ کشمیر سے لوٹتے ہوئے لاہور میں آپ سے ہوئی تھی۔ اس کے مناسب جو تعلیم و تربیت نوجوانوں کو زمانہ تعلیم میں دی جا سکتی ہے یہاں جاری کر دی ہے۔ باہر بھی کام شروع ہو جانا چاہئے۔ اس کے متعلق مجھے آپ سے کلی اتفاق ہے کہ دس بارہ ہم خیال اور ممتاز مسلمان ایک جگہ جمع ہو جائیں اور ایک امیر منتخب کر لیں اور دنیا میں اس کا اعلان ہو جائے۔

اس غرض کے لئے میں نے ایک تحریر لکھی ہے جو آپ کے ملاحظہ کے لئے ملفوف ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ یہ تحریر نیز دیگر ضروری ہدایات لے کر میر نیرنگ پنجاب کے دورے کے واسطے اٹھیں اور اہل لوگوں سے جابجا ملیں اور بالمشافہ گفتگو کریں۔ اس سلسلے میں غالباً وہ آپ سے خط و کتابت بھی کریں گے اور آپ کی خدمت میں بھی آئیں گے تا کہ مفصل گفتگو ہو جائے۔

دو کاغذ اور ملفوف ہیں ایک میں تو وہ حلف یا بیعت ہے جو امیر ہر رکن سے لے گا۔ دوسرے میں وہ وعدے ہیں جو غایت قصویٰ کو حاصل کرنے کے لئے فی الحال جملہ ارکان سے لینے چاہئیں۔

میری رائے میں ارکان کی دو قسمیں ہوں گی' عام اور خاص۔ عام سے بیعت اس پر لی جائے گی کہ وہ مسلمانوں کے عروج و اقبال کو اپنی غایت بنائیں گے اور خواص وہ ہوں گے جو راز کے متحمل ہو سکیں۔ انہیں عروج و اقبال کے اصلی معنی سمجھا دیئے جائیں گے۔ عہدہ دار اور کارکن خواص میں سے ہوں گے۔ خواص ہی میں سے مجلس شوریٰ ہو گی۔ مجلس شوریٰ محض ایک مشاورتی جماعت ہو گی۔ فصل امور کا حق اصولاً فقط امیر کو ہو گا یعنی امیر انتخاب سے ہو گا لیکن اختیارات اس کے تام ہوں گے۔

امیر کا عزل و نصب ایک نہایت اہم مسئلہ ہے۔ اس کی صورت ایسی ہونی چاہئے جس میں جمہوریت فرنگ کے مضار کم سے کم ہوں اور اوائل اسلام کی روایات زیادہ سے زیادہ۔ بہت سی ردوقدح اور غور و فکر کے بعد جو اس کی صورت سمجھ میں آئی ہے وہ بھی میر نیرنگ آپ سے عرض کریں گے۔

کام کو پنجاب سے شروع کرنا چاہئے' جب وہاں کچھ تقویت پکڑ جائے تو فوراً سندھ' سرحد اور بلوچستان میں بھی شروع کر دیا جائے۔

پنجاب کا امیر' امیر لاہور کہلائے کیونکہ اس میں گنجائش رہے گی کہ حسب ضرورت اس کا احاطہ اقتدار وسیع کیا جا سکے۔ غالباً اسے ہی آئندہ سب مسلمان صوبوں کا امیر بننا ہو گا۔

جماعت کا نام جماعت مجاہدین بہتر معلوم ہوتا ہے۔ ملک کی سیاسیات میں اس

وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم تمام مسلمان صوبوں یعنی پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان نیز بنگال کے مابین مفاہمت کو اپنا نصب العین بنائیں۔ زیر تجویز سکیم کے جاری ہو جانے کے بعد کوئی مناسب موقعہ نکال کر پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان کی ایک فیڈریشن بنوانے کو اپنا نصب العین بنالیں جو باقی ہندوستان سے بالکل علیحدہ ہو یعنی جس کی فوج خزانہ وغیرہ اپنا ہو۔

جماعت کا سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ مسلمانوں کی فوجی تنظیم بہت تیزی کے ساتھ کرلی جائے یعنی قوائے جسمانی کی درستی۔ لکڑی اور ہتھیار چلانے کی قابلیت بہتر اجتماعی اور انفرادی مدافعت و مجارحت کے طریقے مسلمانوں میں عام ہو جائیں اور وہ سب ایک نظم میں منضبط ہوں تاکہ انہیں دبانا اور مٹانا آسان نہ رہے۔

اس کے ساتھ ہی بعض اصولی اصلاحیں مسلمانوں کی اقتصادی اور معاشرتی زندگی میں ضروری ہیں اور ان کے تحت میں اخلاقی اور روحانی اصلاحیں۔

رائے عالی سے مطلع فرمایئے۔ میں ابھی چند دنوں تک یہاں ہوں۔

والسلام ظفرالحسن"

اب تک کی خط و کتابت سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ معاملہ بتدریج آگے بڑھ رہا تھا۔ تشکیل جماعت کے ابتدائی مراحل طے کرلئے گئے تھے اور اب یہ قافلہ جادہ پیمائی کے لئے پر تول رہا تھا۔ لیکن اس کے بعد ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب کی روایت کے مطابق ایک خاص سبب سے ڈیڑھ پونے دو برس کا عرصہ تعطل کا گزرا۔ ہوا یہ کہ اس دوران افغانستان کے فرمانروا غازی نادر خان نے افغانستان میں تعلیمی اصلاحات کا اعلان کیا۔ نادر خان نے یہ طے کیا کہ یہ اصلاحات علامہ اقبال، سر راس مسعود اور علامہ سید سلیمان ندوی کے مشورے پر مبنی ہوں گی۔ چنانچہ علامہ کو اس ضمن میں مذکورہ حضرات کے ساتھ کابل کا سفر کرنا پڑا۔ آپ کچھ روز وہاں قیام پذیر بھی رہے۔ اس وفد کی واپسی کے کچھ ہی عرصہ بعد کابل سے یہ افسوسناک خبر موصول ہوئی کہ نادر شاہ بھرے دربار میں شہید کردیئے گئے۔ چنانچہ اس کے بعد کچھ عرصہ افسردگی اور خاموشی کا گزرا جس کے دوران "جماعت مجاہدین" کے باب میں کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ پھر اغلباً ۱۹۳۴ء کے اواخر میں میر سید

غلام بھیک صاحب نیرنگ نے جو تشکیل جماعت کے ضمن میں ڈاکٹر سید ظفرالحسن کے ہم خیال تھے' سلسلہ جنبانی کیا جس کا اندازہ علامہ کے نام میر صاحب کے اس خط سے ہوتا ہے جو انہوں نے ۱۵/ جنوری ۱۹۳۵ء کو انبالہ سے تحریر کیا :

"مکرمی ڈاکٹر صاحب' السلام علیکم

کاغذات مرسلہ کی رسید پہنچ گئی۔ آپ کی تحریر کردہ باقی ماندہ کاغذات کی تلاش کی تو وہ مل گئے۔ علیحدہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ بھی بھیجتا ہوں۔

آپ کارروائی کیجئے۔ میں تو اب بے حد بے فرصت ہو گیا ہوں۔ مسودات کی تیاری خود آپ کی ہدایت سے آپ کے روبرو ہونی چاہئے۔ البتہ کسی وقت حسب ضرورت میں لاہور حاضر ہو سکتا ہوں۔ ڈاکٹر ظفرالحسن صاحب کو بھی لکھ لیجئے کہ بوقت ضرورت آنے کو آمادہ رہیں۔ زیادہ نیاز۔ والسلام

بندہ غلام بھیک نیرنگ

"۱۵-۱-۳۵

حضرت علامہ کی جانب سے اس خط کا فوری رد عمل ڈاکٹر سید ظفرالحسن صاحب کے نام ان کے اس خط کی صورت میں ظاہر ہوا جو ۱۷ جنوری ۳۵ء کا تحریر کردہ ہے۔ اس خط سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اس دوران میں علامہ کے ایک عقیدت مند خواجہ عبدالوحید صاحب نے علامہ ہی کے ایما پر بعض احباب کے ساتھ مل کر جماعت مجاہدین' علی گڑھ کے طرز پر لاہور میں جمعیت شبان المسلمین ہند کی تاسیس کے منصوبے پر کام کا آغاز کر دیا تھا۔ (اس کی تفصیل ہمارے اس بیان میں ذرا آگے چل کر آئے گی) علامہ لکھتے ہیں :

"ڈیئر ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم

معاملہ معلومہ کے متعلق میر صاحب نے انبالے سے تمام کاغذات مجھے بھیج دیئے ہیں' کچھ باقی رہ گئے وہ بھی آج مل گئے ہیں۔ اگر آپ کے غور و فکر کا کچھ مزید نتیجہ نکلا ہو وہ بھی لکھ کر ارسال کر دیجئے۔ شاید خواجہ وحید صاحب نے آپ کو لکھا ہو گا۔ یہاں کے لوگوں نے بھی تجویز کا بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا ہے۔ اگر کوئی

اچھی جمعیت پیدا ہو گئی تو میں آپ کو اور میر صاحب کو چند گھنٹوں کے لئے لاہور آنے کی تکلیف دوں گا۔ آپ اس مہم کے لئے آمادہ رہئے۔ بچے کی دعا!

محمد اقبال لاہور

۱۷ جنوری ۳۵ء"

ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب نے بھی حضرت علامہ کے اس خط کا جواب تحریر کرنے میں کوئی تاخیر نہیں کی۔ ان کے جوابی خط پر ۱۹ جنوری کی تاریخ درج ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس روز علامہ کا خط انہیں موصول ہوا اسی روز انہوں نے مفصل جوابی خط سپرد ڈاک کر دیا۔ اس خط میں جماعت مجاہدین کی تنظیمی ہیئت کے ضمن میں بعض مزید تفصیلات بھی مذکور تھیں۔ خط کا متن درج ذیل ہے :

"۱۹/ جنوری ۳۵ء

محترم۔ تسلیم

خواجہ وحید صاحب کی تحریر سے ایک شائبہ سا پیدا ہوا تھا۔ آپ کے کارڈ نے جان ڈال دی۔ خدا کرے یہ کام ہو جائے۔ میں ایک دفعہ نہیں ہزار دفعہ آؤں گا اور ایک نظم میں امیر کے حضور میں نذر گزاروں گا۔

ڈیڑھ دو سال سے منظم طور پر کام ہو رہا ہے۔ اس کا پہلو تلقین ہے۔ خیالات کی ایک محدود اور منتخب جماعت خاص بن گئی ہے مگر نشر خیالات عام ہے۔ پس اندریں اثناء ہم اسی پہلو سے غور بھی کرتے رہے ہیں۔ اس لئے کوئی نئی بات عرض نہیں کر سکتا۔

ڈھائی سال ہوئے بہت غور و تمحیص کے بعد ایک پورا نظام تجویز کیا تھا۔ اس کی تدوین خیری صاحب کے سپرد ہوئی۔ وہ ذرا نامکمل رہ گئی اور اس میں عربی مصطلحات کا ذکر زیادہ آ گیا۔ اس پر نظر ڈال کر بذریعہ رجسٹری آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ نقل کروالیں اور اصل مجھے واپس فرمادیں۔

اس سلسلے میں چند امور عرض کر دوں جو ان کاغذات میں نہیں ہیں :

۱۔ فداکاروں کی ایک جماعت خفیہ ہو گی جو امیر کے ہاتھ میں تلوار کی طرح کام کرے گی۔ اس کا نظام بہت سوچ کر طے ہو گا۔ اس پہلو پر ارشاد ہو تو اپنے

اور خیری صاحب کے خیالات عرض کروں گا۔

۲ ۔ ارکان خاص میں وہ لوگ نہیں لئے جائیں گے جن کے اصول مذہبی اس جماعت کے اصول کے منافی ہیں' مثلاً قادیانی۔

اگر ارکان خاص میں انکا لینا نظریہ مصلحت سے جائز رکھا جائے تو یہ ایک وقتی ہنگامی' اضطراری امر کی طرح ہونا چاہئے کہ یہ لوگ امیر جماعت ہند وغیرہ نہیں بن سکتے اور نہ اس کی جماعت عاملہ میں لئے جائیں گے اور نہ فدا کاروں میں۔ ایک مختصر سا فنڈ بھی میرے پاس جمع ہے۔

اعضائے عام یعنی ارکان عام سے بیعت کی صورت... خدا کو حاضر و ناظر جان کر پورے صدق اور تہ دل سے عہد کرتا ہوں کہ :

- ہندوستان میں مسلمانوں کا عروج و اقبال ہمیشہ میری غایت ہوگی اور اس غایت کو حاصل کرنے کے لئے میں اپنی جان' مال' آسائش اور عزت سب کچھ قربان کرنے کو ہمیشہ تیار اور آمادہ رہوں گا۔
- اس غایت کو حاصل کرنے کے واسطے جو حکم امیر مجھے دے گا اس کی بے چون و چرا بدل و جان تعمیل کروں گا۔

اعضائے خاص سے جو بیعت خاص لی جائے گی اس میں غایت ہوگی "اسلامی اصول پر حکومت قائم کرنے کی"۔ باقی وہی جو اعضائے عام کی بیعت میں ہے۔

میں نے آغا خان سے بھی اس باب میں چھیڑ چھاڑ شروع کی تھی۔ اپنے اور ان کے خط کی نقل ملفوف کرتا ہوں' ان تلوں میں کچھ تیل ہو تو نکالا جائے۔

بچہ (احمد) سلام عرض کرتا ہے اور آپ کو اکثر یاد کرتا رہتا ہے۔ بانگ درا کو بہت شوق سے پڑھتا ہے۔ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

خادم' ظفر"

اپنے اس خط کے آخر میں ڈاکٹر سید ظفر الحسن نے ایک نوٹ کا اضافہ بھی کیا تھا۔ یہ نوٹ بھی چونکہ ہمارے اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے لہٰذا اسے بھی ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے :

"نوٹ : ہماری غایت اصل میں سارا عالم ہے مگر بہ ضرورت وہ اس تدریج کے ساتھ محدود ہوتا چلا جاتا ہے۔

دنیا۔ دنیائے اسلام' ہندوستان' مسلم انڈیا (اسلامی ہند) شمال مغربی ہند۔ پس عملاً ہمیں معکوس تدریج سے اپنی غایت کو وسعت دیتے رہنا ہو گا۔

۱۔ شمال مغربی ہند[3] ۲۔ بنگال آسام ۳۔ شمالی ہند
۴۔ ہندوستان ۵۔ دنیائے اسلام ۶۔ دنیا۔

یہ تنظیم پہلے پنجاب اور پھر صوبہ سرحد' سندھ' بلوچستان سے چلے گی۔ یہاں کام پوری طرح متشکل ہو جائے تو پھر باقی شمال و مشرقی ہندوستان یعنی صوبہ متحدہ' بہار' بنگال و آسام میں پھیلایا جائے' اس کے بعد جنوبی ہند میں۔

تحریک کے غیر فرقہ وارانہ کردار کو اول دن سے قائم رکھنا چاہئے تا کہ کبھی یہ تحریک فرقہ واریت کا شکار نہ ہونے پائے اور شمال مغربی ہند میں کام شروع ہونے کے بعد جلد شمال مشرقی اور جنوبی ہند میں شروع کر دیا جائے"۔

☆ ☆ ☆

علامہ اقبال اور ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب کی اس باہمی خط و کتابت اور بالخصوص ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب کے نام حضرت علامہ کے مذکورہ بالا خط (مرقومہ ۱۷/ جنوری) اور ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب کی جانب سے اس کے مفصل جواب کو اگر بیک نگاہ سامنے رکھا جائے اور ان خطوط کے متون کے ساتھ ساتھ ان کے بین السطور عبارتوں کو بھی اگر پڑھنے کی کوشش کی جائے تو درج ذیل امور نکھر کر سامنے آتے ہیں :

۱) حضرت علامہ اور ڈاکٹر سید ظفر الحسن' دونوں اس کام کو آگے بڑھانے اور بھرپور جماعتی جدوجہد کا آغاز کرنے کے لئے بے تاب تھے۔

۲) لاہور میں علامہ اپنے طور پر' اپنے ایک قریبی ساتھی اور عقیدتمند خواجہ عبدالوحید صاحب کے ذریعے جنوری ۱۹۳۵ء میں فدائین کی ایک جماعت کی ترتیب و تشکیل کے کام کا آغاز کر چکے تھے۔

۳) جماعت مجاہدین علی گڑھ نے اس سے ڈیڑھ دو سال قبل ابتدائی سطح کی دعوتی سرگرمیوں کا آغاز منظم انداز میں کر دیا تھا۔ تاہم ڈاکٹر سید ظفر الحسن اس بات کے

---

[3] یعنی موجودہ پاکستان جس کی "بشارت" حضرت علامہ نے خطبہ الٰہ آباد میں دی تھی۔

شدت کے ساتھ متمنی تھے کہ سالار قافلہ کے طور پر علامہ اقبال قیادت و رہنمائی کے منصب پر فائز ہوں تاکہ انکے زیر امارت اس کام کو بھرپور اور موثر انداز میں آگے بڑھایا جاسکے۔ چنانچہ ڈاکٹر سید ظفرالحسن نے اپنے خط میں اپنی جس خواہش کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے کہ :"خدا کرے یہ کام ہو جائے۔ میں ایک نہیں ہزار دفعہ آؤں گا اور ایک نظم میں امیر کے حضور نذر گزاروں گا" اس کی وضاحت میں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی لکھتے ہیں :"امیر کی خدمت میں جو نظم پیش کرنے کے لئے کہا گیا تھا اس کے نذر کرنے کی نوبت اس لئے نہ آسکی کہ علامہ اقبال کی صدارت میں اس جماعت کا قیام اور اس کے قیام کا اعلان ملتوی ہوتا رہا"۔ گویا یہاں "امیر" سے مراد خود حضرت علامہ ہیں۔

۴) اس جماعت کے بارے میں یہ طے کرلیا گیا کہ یہ ٹھیٹھ اسلامی اصولوں یعنی نظام بیعت پر استوار ہوگی جس کے ارکان کے لئے امیر کے ہر حکم کی بے چون وچرا اور بہ دل و جان اطاعت لازم ہوگی۔ گویا "سمع و طاعت" کا اصول اپنی حقیقی صورت میں یہاں نافذ و جاری ہوگا۔ گو ڈاکٹر سید ظفرالحسن صاحب کے خط میں "سمع و طاعت" کے ساتھ "فی المعروف" کی شرط مذکور نہیں ہے' تاہم ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اتنی بین حقیقت ہے کہ اس کی صراحت کی ضرورت انہوں نے محسوس نہیں کی اور اسے از خود شامل سمجھا۔

۵) مجوزہ جماعت کے بارے میں یہ بھی طے کیا گیا کہ اس میں امیر کو کلی اختیارات حاصل ہوں گے۔ مجلس شوریٰ کا کام فقط مشورہ دینا ہوگا نہ کہ کثرت رائے سے فیصلہ کرنا۔ نیز یہ کہ امیر کو مجلس شوریٰ کی تمام تحریکوں اور فیصلوں کو برطرف کردینے کا اختیار بھی حاصل ہوگا' جسے عرف عام میں "ویٹو" (VETO) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۶) "صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم" کے مصداق اس جماعت میں فداکاروں کی ایک خفیہ جماعت امیر کے ہاتھ میں تلوار کی طرح کام کرے گی۔ اور اس جماعت میں ارکان دو طرح کے ہوں گے : i) عام ارکان' اور ii) ارکان خاص۔

۷) اگرچہ اس جماعت کے تمام ارکان ہندوستان میں مسلمانوں کے عروج و اقبال کی

خاطر اپنا تن من دھن نچھاور کرنے کا عہد اور امیر کے ہاتھ پر سمع وطاعت کی بیعت کریں گے' تاہم اس جماعت کی ریڑھ کی ہڈی کا مقام ارکان خاص کو حاصل ہو گا۔ ان سے جو بیعت لی جائے گی اس میں غایت اور مقصود کے طور پر "ہندوستان میں مسلمانوں کے عروج واقبال" کا ذکر نہیں ہو گا بلکہ "اسلامی اصولوں پر حکومت قائم کرنا" غایت کے طور پر متصور ہو گا۔

۸) جماعت کے تمام اہم مناصب صرف ارکان خاص کے لئے مخصوص ہوں گے اور "فداکاروں" کی جماعت بھی انہی میں سے ترتیب دی جائے گی۔

۹) جماعت مجاہدین علی گڑھ کے پیش نظر اصلاً پوری دنیا میں اسلامی اصول پر حکومت قائم کرنا یعنی دین حق کا عالمی غلبہ تھا' لیکن ظاہر بات ہے کہ جماعت کے موسسین اس بات کو بخوبی جانتے اور سمجھتے تھے کہ یہ کام مرحلہ وار ہی ممکن ہے۔ اس کا آغاز کسی ایک خطے سے ہو گا اور پھر یہ معاملہ بتدریج وسعت پذیر ہو گا۔ چنانچہ یہ اسی حقیقت پسندی کا مظہر ہے کہ ڈاکٹر سید ظفر الحسن نے اپنے لئے کام کی جو ترتیب معین کی اس میں انہوں نے اپنا ہدف اول شمال مغربی ہند کو قرار دیا ہے۔ اس حد تک غایت کی تکمیل کے بعد بنگال و آسام تک اس کام کو وسعت دینا' پھر شمالی ہند تک' اس کے بعد پورے ہندوستان پر' پھر دنیائے اسلام پر اور آخر میں پوری دنیا پر اسلامی حکومت کا قیام ان کے پیش نظر تھا۔

گویا ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت کا مکمل نقشہ ہم اس خاکے میں دیکھ سکتے ہیں۔ اور ہمارے لئے نہایت اطمینان کی بات یہ ہے کہ تنظیم اسلامی کی اٹھان بھی بحمد اللہ تقریباً انہی خطوط پر ہوئی ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ طریق تنظیم براہ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و سیرت اور اسلام کے قرن اول سے ماخوذ ہے' اور ہمیں خوشی ہے کہ حکیم الامت اور مجدد فکر اسلامی' علامہ اقبال اور ان کے نیاز مند ڈاکٹر سید ظفر الحسن نے بھی جو خود اپنی جگہ علم و فضل کا کوہ ہمالہ تھے' نظام بیعت و امارت ہی کو صحیح اسلامی اصول جماعت قرار دیا۔ یہی نہیں بلکہ جماعت کی تنظیمی ہیئت سے متعلق تفصیلی خاکہ جو انہوں نے مرتب کیا وہ بھی بہت سے اعتبارات سے حیرت انگیز طور پر تنظیم اسلامی کے نظام کے مشابہہ اور

مماثل ہے۔ گویا "متفق گردید رائے بو علی با رائے ما"۔ لطف کی بات یہ ہے کہ حضرت علامہ کی حیات کے اس اہم گوشے اور ایک اسلامی انقلابی جماعت کی ہیئت تنظیمی کے بارے میں حضرت علامہ کے خیالات و نظریات سے تنظیم اسلامی کے امیر اور ان کے ساتھی تاحال بے خبر تھے' اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی یہ وقیع تصنیف اگر منظر عام پر نہ آتی تو آئندہ بھی شاید ہمیشہ کے لئے بے خبر ہی رہتے۔ اس کے باوجود اکثر جزئیات تک میں کامل اتفاق کا پایا جانا انتہائی حیران کن ہے اور یقینی طور پر اس امر کا مظہر ہے کہ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کو علامہ اقبال کے ساتھ صرف ذہنی و فکری ہی نہیں ایک خصوصی روحانی نسبت بھی حاصل ہے۔ (جاری ہے)

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: قال رسول اللہ ﷺ:

((اِنَّ الرَّجُلَ الَّذِیْ لَیْسَ فِیْ جَوْفِہٖ
مِنَ الْقُرْآنِ شَیْءٌ کَالْبَیْتِ الْخَرِبِ))

رواہ احمد والترمذی' وقال: حسن صحیح

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جس شخص کے سینے میں قرآن میں سے کچھ بھی محفوظ نہ ہو وہ ویران گھر کی مانند ہے"۔

ضرورت رشتہ

شادمان میں سرکاری رہائش میں مقیم وزارت دفاع کے ایک گزیٹڈ آفیسر کو دوسری شادی (اولاد نہ ہونے کی وجہ سے) دینی مزاج کے حامل گھرانے سے نیک سیرت' شرعی پردہ کرنے والی اور تعلیم یافتہ دوشیزہ کا رشتہ درکار ہے۔

برائے رابطہ: محمد عطاء اللہ صدیقی' ۸۵۔ شاہ جمال' لاہور

انجمن کے بعد تنظیم کیوں؟

(جولائی ۱۹۷۴ء میں راقم الحروف نے اپنی جس تقریر میں تنظیم اسلامی کے قیام کا اعلان کیا اور جو اب "عزمِ تنظیم" کے نام سے طبع ہوتی ہے وہ اواخر ۷۴ء میں "میثاق" میں راقم کی اس تحریر کے ساتھ شائع ہوئی جو اب "تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر" کے عنوان سے طبع ہوتی ہے ----- اس پر ایک مخلص کرم فرما کی جانب سے ایک مفصل خط موصول ہوا کہ اس سے کرنے کا وہ "اصل کام" رہ جائے گا جس کا تذکرہ "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ" میں کیا گیا ہے ---- اس پر جو خط راقم نے انہیں تحریر کیا تھا اس کی حیثیت اب ایک تاریخی دستاویز کی ہے' لہٰذا وہ رفقائے تنظیم اسلامی کے افادہ کے لئے ذیل میں شائع کیا جارہا ہے ---- اسرار احمد عفی عنہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

۱۲۔ افغانی روڈ' سمن آباد' لاہور

۳/مارچ ۱۹۷۵ء

برادر مکرم' وفقنا اللہ وایاکم لما یحب ویرضٰی!

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!!

امید ہے کہ آپ مع اہل خانہ وجملہ احباب ورفقاء بخیر وعافیت ہوں گے'

----- آپ کا یکم دسمبر ۷۴ء کا مرقومہ اور لگ بھگ ۲۰/جنوری ۷۵ء کا موصولہ سترہ صفحات پر مشتمل گرامی نامہ پیش نظر ہے۔ اس دوران میں کئی بار اس کا جواب تحریر کرنے کی غرض سے اسے

ازابتدا تا انتہا پڑھا۔ لیکن پھر کوئی چیز ایسی سامنے آگئی کہ ادھر متوجہ ہو جانا پڑا اور جواب رہ گیا۔

-----مجھے آپ سے ایک "حسنِ ظن" تو یقیناً تھا۔ لیکن اتنا ہرگز نہ تھا جتنا اس خط کے بعد ہو گیا ہے۔ احیائے اسلام کی "آرزو" (آپ کے پاس تو یقیناً اپنے خط کی نقل نہ ہوگی۔ اس لئے آپ کے الفاظ for ready reference درج کئے دیتا ہوں: "....اس جسارت کی محرک آپ سے ایک نسبت ہے۔ احیائے اسلام کی جس تڑپ نے آپ کو عملِ پیہم پر اکسایا ہے وہ ایک آرزو کی شکل میں میرے دل میں بھی نشوونما پاتی رہی ہے....") بھی اس دور میں بسا غنیمت ہے' بقول علامہ اقبال ع "مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دارا" اور "آرزو اول تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں---اور ہو جائے تو مرجاتی ہے یا رہتی ہے خام!"-----اب اگر یہ آپ کے "دل میں نشوونما پاتی رہی ہے!" تو اور کیا چاہئے؟ فھو المطلوب! آرزو حقیقی اور طلب صادق ہو تو وہ اپنے لئے عمل کی راہیں خود پیدا کر لیتی ہے---جلد نہ سہی ذرا دیر سے سہی! کسی اور کے ساتھ نہ سہی اپنے طور پر سہی! (ع "تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن!")

آپ نے میری تحریروں میں سے "نشاۃِ ثانیہ" کو بجا طور پر اہمیت دی ہے۔ میں خود بھی محسوس کرتا ہوں کہ میری اب تک کی سوچ کا نقطہ عروج وہی ہے! مجھے بخدا نہ مفکر ہونے کا دعویٰ ہے نہ متفکر ہونے کا (حال ہی میں ایک رسالے میں ان دو الفاظ کے مابین فرق پر بحث نظر آئی ہے!) تاہم میری تحریکی یا احیائی سوچ جیسی کچھ اور جتنی کچھ بھی ہے اس میں عمودی بلندی یا گہرائی کے اعتبار سے اہم ترین تحریر "نشاۃِ ثانیہ" والی ہی ہے البتہ افقی وسعت کے اعتبار سے میری سب سے زیادہ اہم وہ تحریر ہے جو اکتوبر نومبر ۷۴ء کے میثاق میں بطور "تذکرہ و تبصرہ" شائع ہوئی ہے! (مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اسے آپ نے کچھ زیادہ ہی رواروی میں پڑھا ہے۔ کیا اس پر ایک نگاہ بازگشت کے لئے وقت نکال سکیں گے؟) (نوٹ: یہ تحریر اب "تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر" کے عنوان سے طبع ہوئی ہے!)

آپ نے میری اس تحریر کے غالباً صرف اس حصے سے اختلاف ظاہر کیا ہے جو تبلیغی جماعت کی تحسین پر مشتمل ہے۔ بقیہ پورے مضمون کے Main line of Argument سے اغلباً

آپ کو کامل اتفاق ہے۔

آپ کو اصل اندیشہ' جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں' یہ ہے کہ تنظیم اسلامی کی وسیع تر سرگرمیوں اور اس کی گراں تر ذمہ داریوں کے باعث "اسلام کی نشأۃ ثانیہ" کے لئے "کرنے کا اصل کام" رہ جائے گا۔ خصوصاً جبکہ میری قوتِ کار یا صلاحیتِ کار جتنی ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ ایک ماہنامہ تو میں صحیح طرح چلا نہیں پایا!---مزید برآں یہ کہ "انجمن خدام القرآن کے دائرۂ کار میں رہ کر آخر ایسی کونسی مشکل نظر آئی کہ ایک نئی جماعت بنانے کا ارادہ کر لیا؟"

-----(۱) اس سلسلے میں اولین بات تو یہ پیش نظر رہنی چاہئے کہ دنیا میں علمی و فکری---اور تحقیقی و تصنیفی کام صرف دو طریقوں سے ممکن ہیں۔ یا تو یہ کام حکومت کی زیر پرستی یا صحیح تر الفاظ میں نیم سرکاری اداروں کے تحت ہوتے ہیں جہاں کھلے وسائل موجود ہوں اور محققین و مصنفین کو باوقار مشاہرے دیئے جا سکیں---یا پھر یہ کام کسی زوردار انقلابی دعوت کو لے کر اٹھنے والی تحریکوں اور جماعتوں کے زیر اہتمام ہو سکتا ہے جو ایک طرف ایسے محققین اور مصنفین پیدا کر سکیں جو مشاہروں سے بے پروا ہو کر محض مقصد زندگی کی دھن اور لگن میں اپنے آپ کو کھپا دیں اور دوسری طرف عوام میں اس کام کی اہمیت کا اتنا احساس اور شعور ضرور اجاگر کر دیں کہ اس کے لئے جو کم از کم اور ناگزیر وسائل ضروری ہوں ان کی مسلسل اور uninterrupted بہم رسانی جاری رہے---ان دو کے علاوہ کوئی تیسری ممکن صورت کم از کم میرے علم میں موجود نہیں ہے!

ان میں سے بھی پہلے طریقے پر کوئی تخلیقی کام کبھی نہیں ہوا۔ سرکاری یا نیم سرکاری اداروں کے تحت صرف آثار قدیمہ کی چھان پھٹک کی قسم کا کام ہو سکتا ہے جس سے "تراثِ علمی" (Academic Heritage) کی حفاظت کی خدمت تو سرانجام پا سکتی ہے کوئی تعمیری خدمت ممکن نہیں۔ لہٰذا "احیائے اسلام" کے لئے جس نوع کا علمی کام مطلوب ہے اس کے لئے اب صرف ایک راہ کھلی رہ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک زبردست تحریک برپا ہو جو اولاً احیائے دین کی تڑپ اور لگن بیدار کر دے --- اور ساتھ ہی اس کے لئے جو اہمیت اس علمی کام کی ہے اسے واضح کرے تاکہ ایک طرف اس کے لئے وسائل pool ہو سکیں---اور دوسری طرف وہ نوجوان مل سکیں جو اس کے لئے عمریں کھپا دینے کا عزم مصمم کر لیں----

یہی وجہ ہے کہ خود نشأۃِ ثانیہ میں میں نے (صفحہ ۲۱ پر) عملی اقدامات کے عنوان کے تحت قرآن اکیڈمی کے ذکر سے بھی پہلے دعوت و تبلیغ کے ایک عمومی ادارے کے قیام کی ضرورت کا ذکر کیا ہے! بدیں الفاظ:

"ایک یہ کہ عمومی دعوت و تبلیغ کا ایک ایسا ادارہ قائم ہو جو ایک طرف تو عوام کو تجدید ایمان اور اصلاح اعمال کی دعوت دے اور جو لوگ اس کی جانب متوجہ ہوں ان کی ذہنی و فکری اور اخلاقی و عملی تربیت کا بندوبست کرے اور ساتھ ہی اس علمی کام کی اہمیت ان لوگوں پر واضح کرے جو خلوص اور دردمندی کے ساتھ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے آرزومند ہوں اور دوسری طرف ایسے ذہین نوجوان تلاش کرے----" الخ

جون ۶۷ء میں میں نے میثاق میں وہ تحریر لکھی تھی جو اب نشأۃِ ثانیہ نامی پمفلٹ کی صورت میں موجود ہے اور اسی سال کے اواخر میں عین اسی ضرورت کے تحت تنظیم اسلامی کے قیام کی سعی ہوئی --- یہ دوسری بات ہے کہ وہ بعض وجوہ سے ناکام ہو گئی۔ لیکن اس وقت عرض یہ کرنا ہے کہ اس کا قیام "نشأۃِ ثانیہ" کے اس پروگرام ہی کا ایک جزو تھا نہ کہ اس سے باہر یا اس کے خلاف!

----(۲) دوسری اہم اور توجہ طلب بات یہ ہے کہ ---- "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ" یا "تجدید و احیائے دین" ایک اجتماعی مسئلہ ہے جبکہ "نجاتِ اخروی" کا حصول ہر مسلمان کا ذاتی اور انفرادی مسئلہ ہے۔ ضروری نہیں کہ جو کام احیائے اسلام کے عظیم تر منصوبے کے اعتبار سے مقدم یا اہم تر ہو وہی ہر فرد کے ذاتی و انفرادی نقطۂ نظر سے بھی مقدم اور اہم تر ہو---- پھر کون نہیں جانتا کہ علمی و فکری کام کرنے کی صلاحیت تو کسی کسی ہی میں ہوتی ہے---- جبکہ فلاحِ اخروی کا حصول ہر انسان کے لئے ضروری و لابُدی ہے: اس پہلو سے دیکھئے تو تنظیم اسلامی کا قیام "گھوڑے کے آگے گاڑی جوتنا" نہیں بلکہ ٹھیک گھوڑے کو گاڑی کے آگے جوتنے ہی کا مصداق نظر آئے گا۔ فَافْهَمْ وَ تَدَبَّرْ!

----(۳) رہا مسئلہ میری قوتِ کار یا صلاحیت----یا خصوصاً تنظیمی استعداد کا---تو واقعہ یہ ہے کہ خود مجھے سب سے زیادہ کمزور پہلو یہی نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ایک بہت ہی کمزور اور بے صلاحیت انسان ہوں۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے ذہن ضرور رسا عطا فرمایا ہے اور سمجھ کی گہرائی بھی عطا فرمائی ہے اور یہ بھی اس کی بڑی نعمت ہے (وَاَمَّا بِنِعْمَتِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ!) لیکن واقعہ

یہ ہے کہ اس کی مناسبت سے قوتِ کار یا صلاحیتِ عمل مجھ میں موجود نہیں ہے۔ اور میں خدا کو حاضر ناظر جان کر عرض کرتا ہوں کہ اگر کوئی دوست یا بزرگ مجھے مطمئن کر سکتا کہ استعداد کی کمی یا صلاحیت کے فقدان کے باعث تم اس فریضۂ دینی سے بَری ہو گئے ہو تو میں ان کا عظیم احسان اپنے اوپر سمجھتا' لیکن میرا حال بخدا یہ ہے کہ جو لوگ اس جانب سے مطمئن ہو کر بیٹھ رہے ہیں ان کو دیکھ کر دل سے یہ صدا نکلتی ہے کہ۔

ماہم بہ لاغ و لابہ تسلّا شویم کاش!
ناداں ز بزمِ دوست چہ خوشنود می رود!

اس مسئلے سے متعلق اصلاً تو مجھے صرف یہی کہنا ہے کہ ----- "جزْ دار اگر کوئی مفر ہو تو بتاؤ۔ ناچار گنہگار سوئے دار چلے ہیں!" (فیض) ویسے محض تفنّنِ طبع کے طور پر ذکر کر رہا ہوں کہ خصوصاً میثاق کی اشاعت کی بے قاعدگی کے ذکر سے یاد آیا کہ مرحوم شیخ محمد اکرام نے مولانا مودودی کے بارے میں بھی یہی لکھا تھا کہ ----- "تعجب کی بات ہے کہ ایک شخص بات تو حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی کرتا ہے اور وہ بھی کسی محدود خطے میں نہیں پورے روئے زمین پر ---- اور اس کی صلاحیتِ کار کا یہ عالم ہے کہ "جنگ کے زمانے میں ۴۸ صفحات کا ایک ماہانہ پرچہ بھی باقاعدہ جاری نہ رکھ سکا!"

"تنظیم اسلامی" کی ۶۷ء والی کوشش کی ناکامی کے اسباب متعدد ہیں ---- کی بات بھی بالکلیہ غلط نہیں۔ internal sabotage بھی اس کا ایک سبب تھا ---- اور خود وہ بھی بلا سبب نہ تھا (یہ گلہ جفائے وفانما جو حرم کو اہلِ حرم سے ہے۔ جو میں بتکدے میں بیاں کروں تو صنم بھی بولے ہری ہری!) ----- لیکن ---- فاش تر گویم ---- اس کی اصل وجہ یہ تھی اُس وقت جو لوگ جمع ہوئے ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو اپنے آپ کو اس Cause کے ساتھ Completely identify کرتا ---- کہ۔ "یا تن رسد بجاناں ---- یا جاں ز تن بر آید!!" سب لوگ اسے بس ایک اچھا کام سمجھ رہے تھے ---- کہ ہو جائے تو بہت اچھا ---- نہ ہو تو بھی ایسی کوئی بات نہیں! اور ظاہر ہے کہ اس طرح کی کیفیت کے ساتھ پہلے سے چلتے ہوئے کام تو جاری رہ سکتے ہیں ---- کسی نئے کام کی داغ بیل نہیں پڑ سکتی -----۔ "در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بسے۔ شرطِ اول قدم این است کہ مجنوں باشی!"

اکتوبر نومبر ۷۴ء کے میثاق کے "تذکرہ و تبصرہ" میں جس رجائیت کی جھلک ہے وہ خالص وجدانی ہے اور کبھی کبھی حالات و واقعات کے پیش نظر خود مجھ پر قنوطیت کا تسلط ہونے لگتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ یہ ہوتا ہے عارضی ہی۔ پھر کوئی نہ کوئی کرن امید کی نظر آجاتی ہے --- ویسے بحمد اللہ میں جس راہ پر چلنا چاہتا ہوں اس میں نتائج --- اور کامیابی کی امید ایک بالکل ثانوی --- بلکہ "ثالثی" شے ہے۔ اصل محرک صرف ایک ہے اور وہ ہے احساسِ فرض ----- جس کی تفصیل میں اپنی اس تقریر میں دے چکا ہوں جو اسی پرچے میں شائع ہوئی ہے۔ (یہ تقریر اب "عزمِ تنظیم" کے نام سے طبع ہوتی ہے!)

باتیں تو اور بھی بہت سی کرنی تھیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ معاملات باتوں سے طے ہی نہیں ہوا کرتے --- اکثر باتیں تمام ہو جاتی ہیں اور مسئلہ وہیں کا وہیں رہتا ہے۔ "دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر: ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم!" --- اصل معاملہ دل کا ہوتا ہے۔ دل کسی بات کو قبول کر لے تو عقل کو فوراً ہتھیار ڈال دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا --- اور "دل ابا کر رہا ہو تو عقل کرائے کے وکیل کی مانند دلائل کے انبار لگانے پر مستعد ہو جاتی ہے --- لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظِ مبارکہ کے مطابق گزارش ایک ہی ہے --- یعنی "اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ وَلَوْ اَفْتَاكَ الْمُفْتِي!"

اور اگر کسی درجہ میں درخواست بھی قابل قبول ہو سکے --- تو عرض ہے کہ ۲۳/ تا ۳۱/ مارچ آٹھ دن کی "تفریغ" (تبلیغی جماعت کی اصطلاح ہے --- تفریغِ اوقات --- یعنی وقت کا فارغ کرنا) کر ہی ڈالیں اور لاہور آئیں۔ تاسیسی اجلاس میں بھی شریک ہوں --- اور قرآن کانفرنس میں بھی! پھر جو بھی فیصلہ ہو، ظاہر ہے کہ جبر کا تو کوئی سوال ہی نہیں! --- آخر میں صرف ایک بات اور عرض کر دوں --- آرزو بھی یقیناً بہت غنیمت ہے لیکن تابہ کے؟ اگر یہ واقعتاً سینے کے اندر پرورش پاتی رہی ہے تو اب وقت ہے کہ "بر آور ہر چہ اندر سینہ داری!"

فقط والسلام

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

نفاق کی نشانیاں (۳)

تالیف : فضیلۃ الشیخ الاستاذ عائض عبداللہ القرنی

ترجمہ وحواشی : ابوعبدالرحمن شبیر بن نور

سولہویں نشانی

نیک لوگوں کی عزّت پر حرف زنی کرنا

حرف زنی' استہزاء اور ٹھٹھہ سے مختلف چیز کا نام ہے۔ حرف زنی سے مراد غیبت' طعن' تشنیع اور عیب جوئی جیسے نازیبا اخلاق کام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ سَلَقُوكُمْ بِأَلْسِنَةٍ حِدَادٍ أَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ﴾

(الاحزاب : ۱۹)

"یہی لوگ فائدوں کے حریص بن کر قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبانیں لئے تمہارے استقبال کو آجاتے ہیں"۔

"حِدَاد" سے مراد ہے تلوار کی طرح تیز۔ منافقوں کی نشانی یہ ہے کہ جب نیک لوگوں کے پاس سے اٹھ کر جاتے ہیں تو ان کے بارے میں زبان درازی کرتے ہیں' ان پر الزام تراشی کرتے ہیں' ان پر دانت پیستے ہیں اور محفلوں میں بیٹھ کر ان کے خلاف غیبت کرتے ہیں۔

فتورِ نیت کی وجہ سے کچھ دعائیں بھی غیبت بن جاتی ہیں۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ دعا کرنے والے کے ارادے اور مقصد کے لحاظ سے بعض دفعہ دعاء غیبت شمار ہوتی ہے' حالانکہ وہ بظاہر دعا ہی کر رہا ہوتا ہے' مثلاً اگر تم دریافت کرو کہ فلاں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اور وہ جواب میں کہے : "اللہ ہماری اور اس کی بخشش کرے" تو درحقیقت وہ اپنے لئے اور اس آدمی کے لئے بخشش کی دعا نہیں کر رہا بلکہ اس کا

مقصد کچھ اور ہی ہے۔ اللہ ہی اس کے مقصد کو بہتر جانتا ہے۔ یا وہ جواب میں یہ کہے : "جس معاملے میں وہ پھنس گیا ہے اللہ ہمیں اس سے محفوظ رکھے"۔ یا وہ یوں کہے "اللہ اسے ہدایت دے"۔ اس طرح کے جملے دعا نہیں بلکہ طنز ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ "سبحان اللہ" کہنا بھی غیبت بن جاتا ہے۔ یہی حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کا قول ہے۔ ایک بادشاہ کے سامنے کسی آدمی کا تذکرہ ہوا۔ ایک وزیر نے کہا "سبحان اللہ" یعنی اس سے بچ کر رہو۔ بظاہر تو وزیر نے سبحان اللہ کہا لیکن درحقیقت اس شخص کی عیب جوئی کی اور حقارت کی طرف اشارہ کیا--- ان ارادوں کا اللہ ہی کو صحیح علم ہے۔ جس دن قبر کے مُردے اٹھا دیئے جائیں گے اور دلوں کے راز ظاہر کر دیئے جائیں گے اس دن ان مقاصد کی صحیح حقیقت بھی سامنے آجائے گی۔ تعجب کی بات ہے کہ کچھ لوگ فاسق و فاجر کی غیبت نہیں کرتے' یہودی اور عیسائی بھی ان کی زبان کے تیر سے محفوظ رہتے ہیں' البتہ نیک مسلمان ان کے حملے سے بچ کر نہیں جاسکتا۔

ایک آدمی کسی نیک بزرگ کی محفل میں حاضر ہو کر اپنے بھائی کی غیبت کرنے لگا۔ نیک آدمی نے اس سے دریافت کیا : کیا رومیوں کے خلاف تو نے جہاد کیا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ نیک آدمی نے دریافت کیا : کیا ایرانیوں کے خلاف جہاد کیا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ نیک آدمی نے کہا رومی اور ایرانی تو تجھ سے محفوظ رہ سکتے ہیں البتہ اپنا مسلمان بھائی محفوظ نہیں رہ سکتا' میری محفل سے چلے جاؤ۔ ایک عالمِ دین کی محفل میں کسی آدمی نے دوسرے کی غیبت کی تو عالم نے کہا : اس روئی کے ٹکڑے کو یاد رکھ جسے عزیز و اقارب سکرات الموت کے وقت تیری آنکھوں پر رکھ دیں گے۔ اس دن مال و اولاد کوئی کام نہیں آئیں گے' ہاں البتہ جو آدمی حسد و کینہ سے پاک صاف دل لے کر آیا' اس کا عمل کام آئے گا۔

سترھویں نشانی

نمازِ باجماعت سے پیچھے رہنا

یہ ایک بہت بڑا اور لاعلاج مرض ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں :

((وَمَا يَتَخَلَّفُ عَنْهَا اِلَّا مُنَافِقٌ مَعْلُوْمُ النِّفَاقِ)) {۱}
"نماز باجماعت سے صرف ایسا منافق ہی پیچھے رہتا تھا جس کا نفاق معروف و مشہور تھا"۔

جب تم کسی ایسے آدمی کو دیکھو جو صحت مند' تندرست و توانا اور فارغ ہو اور اس کے پاس کوئی شرعی عذر بھی نہ ہو' اگر اس کے باوجود وہ اذان سننے کے بعد مسجد میں نہیں آتا تو اس کے نفاق کی گواہی دے دو۔

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((وَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِهٖ لَقَدْ هَمَمْتُ اَنْ آمُرَ بِالصَّلَاةِ فَتُقَامَ ثُمَّ اُخَالِفَ اِلٰی اُنَاسٍ لَا یَشْهَدُوْنَ الْعِشَاءَ مَعَنَا۔ [وَفِی لَفْظ لِلصَّلَاةِ] فَاُحَرِّقَ عَلَیْهِمْ بُیُوْتَهُمْ بِالنَّارِ)) {۲}

"اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے' میں نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ میں نماز کھڑی کرنے کا حکم دوں' پھر خود پیچھے رہ کر ان لوگوں کی خبر لوں جو ہمارے ساتھ نماز عشا میں شریک نہیں ہوتے۔ (ایک روایت میں نماز کا لفظ ہے) پھر ان سمیت ان کے گھروں کو آگ لگا دوں"۔

مسند امام احمد میں اس قدر اضافہ ہے :

((لَوْلَا مَا فِی الْبُیُوْتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالذُّرِّیَّةِ)) {۳}

"یعنی میں ایسا ضرور کر گزرتا اگر گھروں میں موجود عورتوں اور بچوں کا خیال نہ ہوتا"۔

(اس کے بعد صحیح بخاری والی روایت کے الفاظ یوں ہیں :)

((وَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِهٖ لَوْ یَعْلَمُ اَحَدُهُمْ اَنَّهٗ یَجِدُ عِرْقًا سَمِیْنًا اَوْ مِرْمَاتَیْنِ حَسَنَتَیْنِ لَشَهِدَ الْعِشَاءَ مَعَنَا))

"اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر ان میں سے کسی کو علم ہو

{۱} صحیح مسلم' کتاب المساجد' باب فضل صلاۃ الجماعہ والتشدید.....
{۲} صحیح بخاری' کتاب الاذان' باب وجوب صلاۃ الجماعۃ
{۳} مسند احمد' ج ۲' ص ۳۶۷

جائے کہ وہاں اسے گوشت سے پُر ہڈی ملے گی یا اچھے سے دو کھُر ہی مل جائیں گے تو وہ ضرور ہمارے ساتھ نماز عشاء میں شریک ہوتا"۔

چنانچہ نماز باجماعت سے پیچھے رہنا نفاق کی علامت ہے۔ جو اپنے گھر میں بیوی اور بیٹی کے ساتھ نماز پڑھ لینا گوارا کرلیتا ہے لیکن جماعت میں شریک نہیں ہوتا' ایسے آدمی کے خلاف نفاق کی گواہی دے دو۔ ایسے آدمی پر نفاق کا حکم لگانے میں ذرا دیر نہ کرو۔ جب تم اسے دیکھو کہ بغیر شرعی عذر کے وہ مسلسل ایسی حرکت کر رہا ہے تو گویا خود اس نے اپنے منافق ہونے کی از خود گواہی فراہم کردی۔ وَالعیاذ باللّٰہ

اٹھارویں نشانی

اصلاح کے دعوے کے ساتھ زمین میں فساد پھیلانا

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :

﴿ وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ○ اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ ○ ﴾ (البقرہ : ۱۱-۱۲)

"جب کبھی ان سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو تو انہوں نے یہی کہا کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں مگر انہیں شعور نہیں ہے"۔

تم ایسے منافق اور فسادی کو دیکھو گے کہ لوگوں میں چغلیاں کرتا پھر رہا ہے' جھوٹی گواہی دے رہا ہے' دو بھائیوں کے درمیان یا باپ بیٹے کے درمیان جھگڑا کھڑا کر رہا ہے' دوسروں کو لڑانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ ایسا آدمی گھاس پھوس کی آگ کی مانند ہوتا ہے جو گھروں کو جلا دیتا ہے اور معاشرے کو تباہ کر دیتا ہے۔ اگر کوئی اسے بطورِ نصیحت کہہ دے کہ تیرا ستیاناس! اللہ سے ڈرو تو قسم کھا کر کہتا ہے کہ میں تو اصلاح کی کوششوں میں لگا ہوا ہوں۔ اللہ رب العزت کو گواہ بنا کر کہتا ہے کہ میں تو اس خاندان یا اس ماحول یا اس قبیلے کی اصلاح کی کوشش کر رہا ہوں' حالانکہ اللہ کو تو خبر ہے کہ وہ فساد پھیلا رہا ہے۔ خاندانوں

اور برادریوں میں ایسے منافق ہی اکثر فساد کا موجب بنا کرتے ہیں۔ ایسا فسادی گواہی میں جھوٹا' بہت باتونی' خود غرض' مذموم مقاصد والا اور نفاق سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِي قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ ﴾ (البقرہ : ۲۰۴-۲۰۵)

"انسانوں میں کوئی تو ایسا ہے جس کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمہیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اور اپنی نیک نیتی پر بار بار اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہے مگر حقیقت میں وہ بدترین دشمنِ حق ہوتا ہے۔ جب اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ اس لئے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے' کھیتوں کو غارت کرے اور نسلِ انسانی کو تباہ کرے' حالانکہ اللہ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا"۔

زمین میں فساد پھیلانا نفاق کی نشانیوں میں سے ہے۔ اس قسم کے فسادی کو جب دو بھائیوں میں غلط فہمی کا پتہ چلتا ہے تو پرائی آگ میں فوراً کود پڑتا ہے۔ پھر پوچھتا ہے تمہارا کیسا جھگڑا ہے' مجھے کل ہی اس اس طرح پتہ چلا' مجھے اس کا بہت دکھ ہوا' میں تو ساری رات سو نہ سکا (خواہ وہ پچھلی رات خوب خراٹے بھر کر سویا ہوا اور اسے یہ بھی خبر نہ رہی ہو کہ وہ کہاں سو رہا ہے؟) بظاہر وہ اصلاح کنندہ کا کردار ظاہر کر رہا ہے اور دل کے حال کو تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

انیسویں نشانی

ظاہر اور باطن کا تضاد

سارے کے سارے سیاپے اسی ایک مسئلے کے اردگرد گھومتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ

اللّٰهِ' وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ' وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝ (المنافقون : ۱)

"اے نبی جب یہ منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔ ہاں اللہ جانتا ہے کہ تم ضرور اس کے رسول ہو' مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں"۔

چنانچہ اگر تم سے دریافت کیا جائے کہ وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے بظاہر سچی گواہی دی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کا اعتبار نہیں کیا اور اس جھوٹی گواہی کی پاداش میں انہیں جہنم میں داخل کر دیا---- یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟۔ کہہ دو یہ منافق ہی ہو سکتے ہیں۔ بظاہر انہوں نے سچی بات کی ہے کہ "محمد" اللہ کے رسول ہیں' لیکن ان کی باطنی کیفیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں جھوٹا قرار دیا۔ اور بظاہر سچی گواہی نے انہیں آگ میں داخل کر دیا۔ تو ثابت ہوا کہ ظاہر و باطن کا تضاد نفاق کی علامت ہے۔ منافق کا ظاہر تو بہت خوبصورت ہوتا ہے لیکن اندر سے تباہ حال! وہ بظاہر خشوع کا اظہار کرتا ہے لیکن اس کا دل ذکر اللہ سے غافل اور بے تعلق ہوتا ہے۔ ایک صالح آدمی یوں دعا کیا کرتا تھا "اے اللہ میں منافقانہ خشوع سے تیری پناہ مانگتا ہوں"۔ دریافت کیا گیا: منافقانہ خشوع سے آپ کی کیا مراد ہے؟۔ فرمایا: کہ جسمانی اعضاء پر تو خشوع و خضوع کی کیفیت طاری ہو اور دل میں خشوع والی کیفیت نہ ہو۔

بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو دورانِ نماز داڑھی اور کپڑوں سے کھیلتے دیکھا تو آپ نے فرمایا:

((لَوْ خَشَعَ قَلْبُ هٰذَا لَخَشَعَتْ جَوَارِحُهٗ)) {۴}

"اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا تو اس کے اعضاء پر بھی خشوع طاری ہو جاتا"۔

یہ سرے سے حدیث ہی نہیں ہے' دیگر حفاظِ حدیث کے علاوہ امام الدار قطنی نے اس کی تردید کی ہے۔ یہ جملہ حضرت سعید بن المسیب کی طرف منسوب ہے' حضور اکرم ﷺ سے ثابت نہیں۔

(جاری ہے)

{۴} یہ قول حضرت سعید بن المسیبؒ کے نام سے بیان کیا جاتا ہے۔ یہ اثر ثابت نہیں ہے' نہ مرفوع' نہ موقوف' تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو ارواء الغلیل' ج ۲' حدیث نمبر ۷۳ ۳' تالیف العلامہ محمد ناصر الدین الالبانی۔

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را!

پاکستانی سیاست کا پہلا عوامی و ہنگامی دَور

(۲)

امیر تنظیم اسلامی اور داعی تحریکِ خلافت پاکستان

ڈاکٹر اِسرار احمد

کے سیاسی تجزیے

جو ۱۹۷۰ء کے دوران ماہنامہ 'میثاق' کے ادارتی صفحات میں شائع ہوئے

باب پنجم

دائیں اور بائیں بازوؤں کی تقسیم

اور

"CIVILIAN COUP D'ÉTAT"

فروری مارچ ۱۹۷۰ء

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی حکومت کو ختم ہوئے اور ملک میں دوسرا مارشل لاء نافذ ہوئے ابھی پورا ایک سال بھی نہیں ہوا' لیکن حالات اتنے بدل چکے ہیں اور ع "کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!" کا ایسا نقشہ بندھا ہے کہ موصوف کی حکومت ماضیٔ بعید کا قصہ اور ازمنۂ قدیم کی داستان نظر آتی ہے۔ بالکل یقین نہیں آتا کہ ایک ہی سال قبل یہاں صدر ایوب "کوس لمن الملک" بجا رہے تھے ----- اور آنجہانی کنونشن مسلم لیگ ملک کی واحد فعال اور نمائندہ سیاسی جماعت ہونے کی مدعی تھی ----!! کہاں آج یہ حال ہے کہ سابق صدر کو کارٹونوں میں سانپ کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے ---- اور لیگ کے ٹوٹے کے سر سے "کنونشن" کا سینگ ہی سرے سے غائب ہو چکا ہے۔ کتنا عظیم انقلاب ہے ---- اور "وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ" کی کیسی کامل تصویر!!

عبرت کی جا ہے کہ وہی لوگ جو کل تک ایوب خان کے بوٹ کی ٹوچا ٹنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے کوشاں نظر آتے تھے آج انہیں گالیوں سے نواز رہے ہیں۔

من تو شدم تو من شدی ' من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

ایسے لوگوں سے تو ہمیں کچھ نہیں کہنا' اس لئے کہ ان کا تو اپنا وجود ہی مسعود ہمارے نزدیک ملک و ملت کے ماتھے کا کلنک کا ٹیکہ ہے ---- سابق صدر کے دورِ اقتدار کے سیاسی مخالفین سے البتہ ہم یہ ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ وہ اب انہیں کوسنا چھوڑ دیں۔ اس لئے کہ سیاسی میدان میں ان کی وفات واقع ہو چکی ہے اور ہمارے دین کی تعلیم یہی ہے کہ "اُذْكُرُوا مَوْتَاكُمْ بِالْخَيْرِ!" ---- ان کا دور گزر گیا۔ اور جو کچھ انہوں نے کیا عدالتِ اخروی میں اس کا حساب کتاب ہو جائے گا

---- تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ لَھَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُمْ مَّا کَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ---- وہ کامیاب ہوئے یا ناکام' ان کا امتحان بہرحال ختم ہو چکا۔ اب امتحان آپ کا ہے' اپنی کامیابی کی فکر کیجئے۔

یہ گھڑی محشر کی ہے' تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!!

خصوصاً ان لوگوں پر تو اس وقت بہت بڑی ذمہ داری عائد ہو گئی ہے جو سابق صدر کی ذات اور ان کی حکومت ہی کو ملک و ملت کے جملہ امراض و علل کا سببِ واحد قرار دیتے تھے کہ اب جبکہ وہ میدان سیاست سے ہٹ گئے یا ہٹا دیئے گئے تو منطقی طور پر انہیں جلد از جلد سب مسائل کو حل کر کے دکھا دینا چاہئے۔ ہماری بھی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس عظیم امتحان میں کامیابی عطا فرمائے۔

اس ایک سال کے عرصے میں پاکستان کی سیاسیات کا جو جدید نقشہ بنا ہے وہ تقریباً وہی ہے جو ہم نے گزشتہ سال جنوری فروری اور مارچ کے شماروں میں "تذکرہ و تبصرہ" کے صفحات میں کھینچا تھا۔ چنانچہ مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ مدیر ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ اپنے ایک حالیہ مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"وہاں (پاکستان) سے کوئی اخبار' رسالہ' پرچہ پرزہ نہ آسکنے کی وجہ سے وہاں کے حالات سے مکمل بے خبری ہے۔ رمضان المبارک میں ہمارے مولانا بنوری مکہ معظمہ پہنچ گئے تھے۔ ان سے اس وقت تک کے حالات خاصی تفصیل سے معلوم ہو گئے تھے اور سن کر قلق اور افسوس ہی ہوا تھا---- لیکن آپ نے بہت پہلے مستقبل کی سیاسی معرکہ آرائی کا جو نقشہ کھینچا تھا' اس کی پوری پوری تصدیق ہو گئی تھی....." [1]

اگرچہ پاکستان کی تاریخ کے اس عظیم ترین سیاسی ایجی ٹیشن میں جو نومبر ۱۹۶۸ء میں شروع ہو کر بالآخر مارچ ۱۹۶۹ء میں دوسرے مارشل لاء کے نفاذ پر منتج ہوا تھا دائیں اور بائیں بازو کے عناصر بہت حد تک گڈمڈ تھے' لیکن دو باتیں بالکل واضح تھیں---- ایک یہ کہ دائیں اور بائیں بازو کے

---

[1] اس عرصے کے دوران میں مولانا نعمانی اور مولانا بنوری دونوں ہی وفات پا چکے ہیں۔ غفر اللّٰہ لھما ورحمھما!

عناصر کی واضح تقسیم کا عمل (POLARIZATION) تیزی سے ہو رہا تھا---اور دوسرے یہ کہ اس عوامی تحریک میں بائیں بازو کے عناصر کا پلڑا فیصلہ کن طور پر بھاری تھا اور دائیں بازو کے عناصر اپنے آپ کو بالکل ایک مخمصے کی سی کیفیت میں گرفتار پا رہے تھے اور اگر وہ تحریک جاری رہتی تو اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان ایک عظیم انقلاب سے دوچار ہو جاتا' جس کی ابتدا بھی کم از کم مشرقی پاکستان میں تو مولانا بھاشانی کی سرکردگی میں ہو گئی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں میں سے کسی میں بھی یہ دم خم نہ تھا کہ وہ اس عوامی تحریک کی راہ روک سکتی۔ یہ تحریک رکی تو صرف سابق صدر ایوب کی حکمتِ عملی سے جس کی لئے صاحب موصوف بالکل بجا طور پر دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کے تشکر و امتنان کے حقدار ہیں!! (چنانچہ گول میز کانفرنس کے دوران ان جماعتوں کے زعماء نے صدر ایوب کی جو مدح و ثنا کی تھی' اس سے یہ قرض کسی حد تک ادا بھی ہو گیا تھا---اور اب اگر ان کی اکثریت دوبارہ اپنی تقاریر کو ان پر تیز و تند تنقید سے مزین کرنے لگی ہے تو یہ غالباً ایک مجبوری ہے جس کے لئے وہ معذور ہیں۔ اس لئے کہ :

ع "بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر!")

سیاسی جماعتوں سے افہام و تفہیم اور گفت و شنید پر آمادگی' ڈی اے سی (DAC) کی نمائندہ حیثیت کو تسلیم کرنا اور پھر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس (RTC) کا انعقاد---ایسے اقدامات کو مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے اُس وقت بالکل بجا طور پر "غیر فوجی انقلاب" (CIVILIAN COUP DETAT) سے تعبیر کیا تھا اور واقعہ یہی ہے کہ ان کے ذریعے کم از کم مغربی پاکستان کی حد تک "انقلاب" کی راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔

گول میز کانفرنس کی ناکامی کا پورا الزام شیخ مجیب الرحمٰن کے سر تو خواہ مخواہ لگ گیا' حتیٰ کہ بعض نادان لوگوں نے اس کا حصہ رسدی میاں ممتاز دولتانہ تک بھی صرف اس لئے پہنچا دیا کہ انہوں نے شیخ صاحب موصوف کو گول میز کانفرنس میں شریک کرنے پر اصرار کرنے میں پہل کی تھی-----ورنہ حقیقت یہ ہے کہ خود شیخ صاحب خالص "سیاسی" آدمی ہیں "انقلابی" ہرگز نہیں'

اور خود ان کی پشت پر بھی مغرب کے ڈوبتے سورج کا سایہ ہے' مشرق کے ابھرتے ہوئے سورج کا نہیں----اصل مسئلہ یہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی ایسے عظیم "انقلابی" آدمی نے عوامی ایجی ٹیشن کی باگ ڈور سنبھال لی تھی---اور شیخ صاحب خوب جانتے تھے کہ اگر وہ راولپنڈی میں کچھ لے دے کر سودا کرلیں تو پلٹن میدان تک پہنچنا تو دور کی بات ہے' ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر اترنا ہی محال ہو جائے گا۔

بہرحال متذکرہ بالا "غیر فوجی انقلاب" مشرقی پاکستان کے لئے ناکافی ثابت ہوا اور وہاں عوامی تحریک کو روکنے کے لئے سابق صدر ایوب کو پہلے آئندہ کے لئے صدارتی الیکشن میں حصہ نہ لینے کے فیصلہ کا اعلان' پھر اگر تلہ سازش کیس کی واپسی ایسی گراں قیمتیں ادا کرنے کے بعد بھی اس کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا کہ خود حکومت سے دستبردار ہو کر نظم و نسق اور امن و امان کے قیام کی ذمہ داری فوج کے حوالے کردیں----اور اس طرح انہیں بالآخر ملک کو دوبارہ فوج کے سپرد کرتے ہی بنی----!! اور پاکستان دوسرے مارشل لاء کی آہنی گود میں چلا گیا۔

مارشل لاء کے نفاذ کے بعد کچھ عرصہ گومگو (SUSPENSE) کی کیفیت طاری رہنا فطری تھا' جس کے دوران عوامی ایجی ٹیشن بالکل فرو ہو گیا اور پاکستان کے مشرقی اور مغربی دونوں خطوں میں پرسکون کیفیت پیدا ہو گئی۔ نتیجتاً دائیں بازو کے "سیاست دانوں" کو بھی سکھ چین کا سانس لینا نصیب ہوا اور انہوں نے بھی بند کمروں' کوٹھیوں کے باغیچوں اور آراستہ پیراستہ ہوٹلوں میں منعقد ہونے والی پریس کانفرنسوں میں چہکنا شروع کردیا۔

اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ ملکی سیاست کے میدان میں دائیں اور بائیں بازو کے کیمپوں کی واضح تشکیل کا عمل (POLARIZATION) بھی وقتی طور پر معطل ہو گیا----!

ادھر نئے صدر مملکت اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر آغا محمد یحییٰ خاں نے کل چھ سات ماہ کے عرصے میں ملک کی اس سیاسی و آئینی گاڑی کو جو پٹڑی سے اتری ہوئی ہے دوبارہ راستے پر ڈالنے کی

غرض سے پُرامن انتقالِ اقتدار کے واضح اقدامات کا متعین پروگرام اور ٹائم ٹیبل سمیت اعلان کر کے اپنے سر سے پورا الزام اتار پھینکا اور ایک انگریزی محاورے کے مطابق گیند کو قطعی طور پر عوام کے پالے میں پہنچادیا---اس طرح "سیاست دانوں" کے لئے تو راہیں ایک دم کشادہ ہوگئیں لیکن "انقلابی" لوگ بالکل اسی طرح کے مخمصے میں پھنس کر رہ گئے جس طرح کے مخمصے میں عوامی ایجی ٹیشن کے دوران دائیں بازو کے سیاست دان پھنس گئے تھے۔

پاکستان کی بائیں بازو کی قوتوں کے بارے میں جنوری ۱۹۶۹ء میں ہم نے یہ رائے ظاہر کی تھی :

"مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی اس کی ایک عظیم علامت ہیں اور مغربی پاکستان میں یوں تو اس کے کئی ایک دھڑے ہیں لیکن اس کی اصل علامت کی حیثیت بلاشبہ مسٹر بھٹو کو حاصل ہو گئی ہے۔ اور اگرچہ ان دونوں کے مابین اشتراکِ عمل کی کوئی واضح صورت تاحال سامنے نہیں آئی، تاہم یہ ایک یقینی امر ہے کہ عنقریب ان دونوں میں اتحاد کی صورت پیدا ہو جائے گی اور پھر یہ بائیں بازو کا وہ اصل مرکز (NUCLEUS) ہو گا جس کے گرد ملک کے تمام سوشلسٹ عناصر حتیٰ کہ معتدل مزاج (یا عام اخباری اصطلاح کے مطابق ماسکو نواز) طبقے بھی جو اس وقت پی ڈی ایم کے ساتھ ہیں، جلد یا بدیر جمع ہونے پر مجبور ہو جائیں گے"۔

ان میں سے مولانا بھاشانی اور ان کے گروہ نے تو تاحال الیکشن میں حصہ لینے کا اعلان بھی نہیں کیا اور وہ برملا کہہ رہے ہیں کہ الیکشن کی کوئی اہمیت سرے سے ہے ہی نہیں، اصل مسئلہ روٹی کا ہے---جسے ووٹ سے قبل حل ہونا چاہئے۔ مغربی پاکستان میں مسٹر بھٹو اگرچہ الیکشن میں حصہ لینے کا اعلان کر چکے ہیں لیکن یہ بھی غالباً یہاں کی عام فضا کے زیر اثر ہے ورنہ ان کی اکثر تقریروں کا ٹیپ کا بند یہی ہوتا ہے کہ پاکستان اس وقت جن مسائل سے دوچار ہے ان کی نوعیت فی الاصل سیاسی نہیں معاشی ہے---بایں ہمہ چونکہ حکومتِ وقت کا موقف بالکل منطقی اور ابتناصاف ہے کہ جس پر کسی براہ راست چوٹ (FRONTAL ATTACK) کی گنجائش نہیں لہٰذا بائیں بازو کی قوتیں اس وقت بالکل "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن" کی سی صورتحال سے دوچار ہیں۔ اور الیکشن کے بارے میں ان کا رویہ ع "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" کا مصداق بن کر رہ گیا ہے۔

ویسے بھی سیدھی سی بات ہے کہ "سیاسی سرگرمی" کی نوعیت کچھ اور ہوتی ہے اور "انقلابی

جدّوجہد" کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں----اور الیکشن کو جہاں ایک طرف سیاسی سرگرمی کے نقطۂ عروج کی حیثیت حاصل ہوتی ہے، وہاں ایک انقلابی کارکن کے نقطۂ نظر سے وہ کھیل تماشے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، بلکہ اس کے نزدیک اس کی اصل حیثیت ایک گلے سڑے نظام کے عفونت بھرے سنڈاس کی ہوتی ہے۔ بقول علامہ اقبال :

الیکشن ، ممبری، کرسی، صدارت — بنائے خوب آزادی نے پھندے
اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں — نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

پاکستان کے سیاسی میدان میں اس وقت دو گروہ تو ایسے ہیں جو "انقلاب" کے علمبردار ہونے کے مدعی ہیں، یعنی ایک بائیں بازو کے عناصر جو سوشلسٹ انقلاب کے علمبردار ہیں اور دوسری جماعت اسلامی جو اسلامی انقلاب کی علمبرداری کا ادّعا کرتی ہے۔ باقی تمام عناصر خالص سیاسی مزاج کے حامل ہیں جن میں سے کچھ قومی سیاست کے علمبردار ہیں، ایک گروہ خالص مذہبی سیاست کا دعوے دار ہے اور بقیہ علاقائی نیشنلزم کا پرچم اٹھائے ہوئے ہیں۔

بائیں بازو کی قوتوں میں سے بھی ہمارے نزدیک خالص اور ٹھیٹھ انقلابی مزاج صرف مولانا بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی کا ہے اور اگرچہ فی الوقت انہوں نے بھی شیخ مجیب الرحمٰن کے بنگلہ نیشنلزم کے نعرے کا مقابلہ کرنے کے لئے پاکستانی قوم پرستی کا راگ الاپنا شروع کر دیا ہے، تاہم حقیقت یہی ہے کہ وہ اول و آخر خالص سوشلسٹ انقلاب کے داعی ہیں۔ رہے مسٹر بھٹو تو وہ بائیں بازو کی جانب فیصلہ کن رجحان رکھنے کے باوجود "انقلابی" سے زیادہ "سیاسی" مزاج کے حامل ہیں۔ بنابریں اگرچہ اسلام پر تو ان کی کرم فرمائی صرف شدید ضرورت کے تحت اور وہ بھی برائے نام ہی ہوتی ہے، تاہم پاکستانی قوم پرستی کا عنصر ان کی تحریک میں ایک مستقل جزو کی حیثیت سے شامل ہے ---- یہی وجہ ہے کہ مولانا بھاشانی اور ان کی جماعت نے نہ صرف یہ کہ تاحال الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ نہیں کیا بلکہ گمان غالب یہی ہے کہ وہ الیکشن کا مقاطعہ کر کے "تحریک" کا راستہ اختیار کریں گے اور کسی نہ کسی راہ سے کوئی عوامی ایجی ٹیشن برپا کرنے کی کوشش کریں گے----اور خود مسٹر بھٹو بھی الیکشن میں حصہ لینے کے اعلان اور اس کی بھرپور تیاری کے ساتھ ساتھ "تحریک" کی راہ بھی کھلی رکھے ہوئے ہیں اور ایسا آتش گیر مواد بھی جا بجا چھڑکتے چلے جا رہے ہیں جو "بوقتِ ضرورت" کام آ سکے اور جس سے کسی مناسب موقع پر کسی عوامی ایجی ٹیشن کا دھماکہ پیدا کیا جا سکے!

رہی جماعت اسلامی تو اس کے بارے میں چونکہ ہماری مستقل رائے یہ ہے کہ اس کی ابتدا تو ضرور ایک انقلابی جماعت کے انداز میں ہوئی تھی لیکن اب اس کا مزاج خالص سیاسی ہے لہٰذا اس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے---- یہاں صرف اس قدر اشارہ کافی ہے کہ اپنے اسی سیاسی مزاج کے ناگزیر تقاضے کے تحت جماعت اسلامی بھی نہ صرف یہ کہ الیکشن کے دنگل میں شرکت کے لئے پورے زور شور کے ساتھ لنگر لنگوٹے کس رہی ہے---- بلکہ اس کے نزدیک الیکشن ہی ملک و ملت کے جملہ مسائل کا واحد حل ہے۔

اصل سیاسی قوتوں میں سے' جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا' کچھ قومی سیاست کی علمبردار ہیں اور نہ صرف پاکستانی قوم پرستی بلکہ کسی حد تک جذبۂ ملی کا پرچم بھی اٹھائے ہوئے ہیں' لہٰذا فطری طور پر ان کے نعروں میں اسلام اور نظریۂ پاکستان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے' چاہے اس کے رہنماؤں کی زندگیوں میں نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ ایسے بنیادی شعائرِ اسلام تک کا دور دور تک کوئی نام و نشان نظر نہ آئے۔ یہ عناصر دراصل تحریکِ مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کے اصل وارث ہیں اور فی الوقت پی ڈی پی اور مسلم لیگ کے ان متعدد دھڑوں پر مشتمل ہیں جن کے مابین بعض سیاسی پہلوانوں کی شخصیتوں کے تصادم کے سوا اور کوئی چیز مابہ الاختلاف موجود نہیں---- دوسرا گروہ جو آل پاکستان سطح پر سیاست میں حصہ لے رہا ہے جمعیت علمائے اسلام کا ہے جو نظریۂ پاکستان سے زیادہ اسلام کا علمبردار ہے اور جس کا اسلام کے ساتھ مخلصانہ تعلق بھی ظاہر و باہر ہے---- لیکن فی الوقت بائیں بازو کی قوتوں کا ساتھ دینے کی وجہ سے کفر تک کے فتووں کا ہدف بن رہا ہے---- اس گروہ کے بارے میں بھی ہم بعد میں تفصیل سے کلام کریں گے۔

باقی سیاسی جماعتیں علاقائی رجحانات کی حامل ہیں جو اپنے اپنے علاقوں کی تہذیب' زبان' کلچر' مالی مفادات اور سیاسی و معاشی حقوق کے تحفظ کے نعروں کے سہارے اقتدار کی جنگ جیتنا چاہتی ہیں ---- ان میں سب سے بڑی اور سب سے زیادہ بااثر جماعت شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ ہے جو بنگلہ نیشنلزم اور مشرقی بنگال کے معاشی و سیاسی حقوق کی بازیافت کی تحریک کا پرچم اٹھائے ہوئے ہے اور اس وقت بلاشک و شبہ مشرقی پاکستان کی سب سے بڑی "سیاسی" قوت ہے۔ دوسرے نمبر پر عبدالولی خان کی نیپ ہے جو سرحد اور بلوچستان میں علاقائی نیشنلزم کو ہوا دے رہی ہے اور کراچی اور مشرقی پاکستان میں مزدوروں اور کسانوں کے مفادات کا دم بھر رہی ہے۔ تیسرے نمبر پر جی ایم سید

اور ان کا سیاسی ٹولہ ہے جو سندھ میں سندھی نیشنلزم کی آگ بھڑکا رہا ہے---ان تمام دھڑوں کے مابین ایک قدر تو مشترک ہے۔ یعنی علاقہ پرستی اور ریجنل نیشنلزم (REGIONAL NATIONALISM) لیکن ایک اہم پہلو مابہ الامتیاز بھی ہے۔ یعنی یہ کہ جب کہ شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی عوامی لیگ پرانے اور پختہ کار RIGHTIST ہیں' بقیہ تمام کے تمام کم از کم معتدل حد تک ضرور LEFTIST ہیں۔

ان اختلافات کے علی الرغم جہاں تک متذکرہ بالا سیاسی گروہوں کا تعلق ہے اس پرانے اور صدفی صد درست مقولے کے مطابق کہ "سیاست میں کوئی چیز آخری اور حتمی نہیں ہوتی!" ان کے مابین جوڑ توڑ' کسر و انکسار اور "ادھر سے کٹ ادھر جڑ" کے عمل کا مستقلاً جاری رہنا بالکل طبعی اور فطری امر ہے اور اس پر خواہ مخواہ ناک بھوں چڑھانے اور واویلا کرنے سے کچھ حاصل نہیں---- البتہ یہ ظاہر ہے کہ کچھ مہلتِ عمر صرف اس اتحاد اور اتفاق کو مل سکتی ہے جو چاہے کتنا ہی جزوی سہی بہرحال کسی نہ کسی قدر مشترک کی بنیاد پر قائم ہو--- مثلاً دولتانہ اور مجیب کے مابین چاہے قومی اور علاقائی سطح کا فرق موجود ہو' دائیں بازو کی قدرِ مشترک بھی موجود ہے۔ چنانچہ ان کے مابین مفاہمت اگر ہو چکی ہے تو کسی قدر پائیدار بھی ثابت ہوگی اور اگر نہیں ہوئی تو کسی بھی وقت ہو سکتی ہے' لیکن جی ایم سید سے دولتانہ کا اتحاد بالکل بے بنیاد تھا اور اسے ختم ہی ہو جانا چاہئے تھا۔ دوسری طرف سید اور مجیب کے مابین علاقہ پرستی کی قدر مشترک موجود تھی جس کی بنا پر اتحاد ہو گیا۔ اور یہ پائیدار بھی ثابت ہوگا' وقس علیٰ ہٰذا۔

> الغرض پاکستان کے سیاسی میدان میں اس وقت ایک جماعت خالص انقلابی ہے یعنی مولانا بھاشانی کی نیپ۔ تین جماعتیں نیم مقصدی اور نیم سیاسی ہیں۔ یعنی جماعت اسلامی' جمعیت علماء اسلام' اور پاکستان پیپلز پارٹی۔ ان میں سے مقدم الذکر دونوں مذہبی رنگ کی حامل ہیں جبکہ تیسری اس اعتبار سے بالکل بے رنگ ہے ---- اور مؤخر الذکر دونوں بائیں بازو سے تعلق رکھتی ہیں' جبکہ پہلی EXTREME RIGHTIST ہے ---- بقیہ تمام جماعتیں خالص سیاسی ہیں' چاہے پاکستانی قومیت کی علمبردار ہوں چاہے علاقائی نیشنلزم کی۔

متذکرہ بالا جماعتوں کے علاوہ کچھ اور گروپ بھی سیاسی میدان میں برسرِ عمل ہیں۔ مثلاً ایک ایئر مارشل اصغر خان جو اپنی ذات ہی میں ایک انجمن ہیں اور اب تک تو کٹی ہوئی پتنگ کے مانند اِدھر اُدھر پھر رہے تھے لیکن اب "تحریک استقلال" کے اجراء کے عزم کے ساتھ از سرِ نو سامنے آئے ہیں------ان کے علاوہ کچھ مذہبی گروپ ہیں جن کی اپنی تو کوئی خاص سیاسی اہمیت نہیں' لیکن اس اعتبار سے خاصی اہمیت ہو گئی ہے کہ ان سب کا متفقہ وزن دائیں بازو کے پلڑے میں پڑ رہا ہے۔ ہماری مراد مرکزی جمعیت علماء اسلام' مرکزی جمعیت اہل حدیث اور جمعیت علمائے پاکستان وغیرہ مذہبی گروہوں سے ہے۔ ان کے سیاسی موقف پر ہم آئندہ اظہار خیال کریں گے۔

پاکستان میں آئندہ حالات کیا رخ اختیار کریں گے؟------اس سوال کے جواب کا کلی انحصار اس امر پر ہے کہ آیا بائیں بازو کی اصل قوتیں مستقبل قریب میں کسی انقلابی تحریک اور عوامی ایجی ٹیشن کے اجراء کا انتہائی اقدام کر گزرتی ہیں یا نہیں---- مولانا بھاشانی کے بارے میں ہم اوپر عرض کر آئے ہیں کہ اِس وقت ان کی حالت اس شیر کی سی ہے جو نرغے میں آگیا ہو اور کسی راستے کی تلاش میں دیوانہ وار اِدھر اُدھر دوڑ رہا ہو۔ چنانچہ وہ کبھی پاکستان کی سالمیت کی دہائی دیتے ہیں کبھی "خلافتِ ربانیہ" کا نعرہ لگاتے ہیں اور کبھی "اسلامی ثقافتی انقلاب!" کا راگ الاپتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تاحال انہیں کوئی "مخرج" نظر نہیں آیا۔ تاہم چند اسباب کی بنا پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ جیسے تیسے کسی نہ کسی بہانے کوئی نہ کوئی انتہائی اقدام کر گزریں گے' اس لئے کہ نرغے میں آئی ہوئی تو بلی بھی شیر ہو جاتی ہے اور ایک DESPERATE انسان سے کچھ بھی بعید نہیں ہوتا۔ پھر مولانا بھاشانی عمر کی اس حد کو بھی پہنچ چکے ہیں جہاں مزید انتظار کی گنجائش مشکل ہی سے رہ جاتی ہے ----دوسری طرف مسٹر بھٹو کو بھی صاف نظر آرہا ہے کہ کسی عوامی ایجی ٹیشن کی صورت میں ان کے CHANCES الیکشن کی نسبت بہرحال زیادہ ہیں' چنانچہ جیسا کہ ہم عرض کر چکے وہ الیکشن کی تیاری کے ساتھ ساتھ پاکستان کی خارجہ حکمتِ عملی میں "SHIFT" اور خصوصاً پاک چین دوستی' ہند و پاک جھگڑے اور قضیئے اور پاکستان اور امریکہ کے تعلقات ایسے مسائل کو بھی چھیڑ رہے ہیں اور کبھی کسی مرکزی وزیر کو برسرِ عام للکار کر اور کبھی لائنسوں اور پرمٹوں وغیرہ کی بندر بانٹ کا تذکرہ کر

کے پر سکون سیاسی فضا میں تلاطم کی لہریں اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مزید برآں "تاشقند کا بلّا" بھی ابھی ان کے تھیلے میں محفوظ ہے۔

اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس وقت زیر ترقی ممالک کی اکثریت جن حالات سے دوچار ہے ان کے پیش نظر خصوصاً ایسے ملکوں میں جہاں سیاسی خلا بھی پایا جاتا ہو' کسی عوامی ایجی ٹیشن کا برپا کر دینا کوئی مشکل کام نہیں----!!

عوام کی زندگی جس طرح دن بدن اجیرن ہوتی چلی جا رہی ہے اس کی بنا پر عوام تو ع "دیوانہ را ہوئے بس است!" کے مصداق بس اس کے منتظر ہوتے ہیں کہ کوئی ذرا ہمت اور جرأت سے کام لے کر ایک بار کوئی زوردار نعرہ لگا دے۔

اور جہاں تک ہمت و جرأت کا تعلق ہے مسٹر بھٹو تو ماضیٔ قریب ہی میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ان میں چاہے اور کسی چیز کی کتنی بھی کمی کیوں نہ ہو' ہمت و جرأت کی ہرگز کوئی کمی نہیں---رہے مولانا بھاشانی تو ان کا بھی پورا سیاسی کیریئر جرأت اور ہمت کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے----!!

بنا بریں پاکستان کے سوشلسٹ عناصر کی جانب سے کسی انقلابی اقدام کا امکان ہرگز خارج از بحث نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ بحالاتِ موجودہ بہت متوقع ہے!!

لیکن اگر ایسا ہو گیا تو----ایک طرف تو اس کا نتیجہ ہمارے نزدیک ایک بہت بڑے خون خرابے کی صورت میں ظاہر ہو گا جو مغربی پاکستان میں تو چاہے زیادہ ہولناک نہ ہو' مشرقی پاکستان میں بالکل انڈونیشیا کے پیمانے پر ہو گا جس کے نتیجے میں پاکستان کا وجود تک سخت خطرے سے دوچار ہو سکتا ہے-----اور دوسری طرف ایسے کسی اقدام سے ہمارے نزدیک بحالاتِ موجودہ سوشلسٹ عناصر کی کامیابی کے امکانات بھی بہت کم ہیں' اس لئے کہ ان کا مقابلہ بیک وقت دو طاقتوں سے ہو گا۔ ایک طرف حکومتِ وقت ہو گی اور وہ بھی سیاسی نہیں فوجی جو امن و امان کو برقرار رکھنے کے فرض کو ادا کرے گی اور دوسری طرف مخالف سیاسی قوتیں ہوں گی جن کو اس طرح آپ سے آپ گویا حکومت کا کور بھی حاصل ہو جائے گا-----اور پاکستان کے سوشلسٹ عناصر ابھی اتنے طاقتور بہرحال نہیں ہیں کہ ایسی دو طرفہ جنگ لڑ کر بھی کامیاب ہو جائیں۔

لہٰذا ہماری استدعا پاکستان کے سوشلسٹ عناصر سے یہی ہے کہ وہ اس آگ سے

کھیلنے کی کوشش نہ کریں بلکہ سیدھی طرح سیاسی میدان میں اپوزیشن کا معروف کردار اختیار کر کے ایک مضبوط اور پیہم سیاسی عمل کے ذریعے رائے عامہ کو ہموار کریں --- اور اس طرح ملک کے سیاسی و معاشی ڈھانچے میں وہ تبدیلیاں برپا کرنے کی کوشش کریں جو انہیں مناسب اور ضروری معلوم ہوں۔

لیکن چونکہ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اول تو ہماری اس درخواست کا اس کیمپ کے کانوں تک پہنچنا ہی بہت مشکل ہے اور اگر یہ مرحلہ بھی کسی طرح سر ہو جائے تو اس کی "قبولیت" کا امکان بہت کم ہے' لہٰذا ہم اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ان حضرات کو تحمل اور بردباری کے ساتھ غور و فکر کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور پاکستان کو بدامنی' انتشار' فتنہ و فساد اور خون خرابے کے اس خطرے سے بچالے جو آج عین اس کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے----!!

اور اگر یہ صورت پیدا ہو گئی-----اور پاکستان کی بائیں بازو کی قوتیں "آخری مقابلے" کو کسی اور موقع کے لئے مؤخر کر کے فی الوقت صرف سیاسی جدّوجہد پر قناعت کرنے پر آمادہ ہو گئیں تو اگرچہ نظریاتی بحث مباحثہ (IDEOLOGICAL DEBATE) کی گرما گرمی تو پھر بھی باقی رہے گی لیکن ظاہر ہے کہ اصلاً سارے کا سارا کھیل خالص سیاسی نوعیت کا رہ جائے گا اور مختلف سیاسی جماعتوں کے مابین "کچھ دے کچھ لے" کے اصول پر کسر و انکسار کے ذریعے معاملات طے ہو جائیں گے۔ اس صورت میں حکومت جو بھی بنے گی بہرحال دائیں بازو کے عناصر پر مشتمل ہو گی اور بائیں بازو کو فی الحال صرف اپوزیشن کی پوزیشن پر اکتفا کرنا ہو گا۔

خالص سیاسی نقطۂ نظر سے ہمارے نزدیک اس وقت مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی عوامی لیگ کو فیصلہ کن قوت حاصل ہے اور مغربی پاکستان کے دائیں بازو کے عناصر کو انہیں چاہے ناگزیر برائی (INEVITABLE EVIL) کی حیثیت ہی سے سہی' بہرحال قبول کر لینا چاہئے-----اس لئے کہ بالآخران کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار بھی نہیں رہ جائے گا اور

ہر چہ دانا کند ' کند ناداں
لیک بعد از خرابیٔ بسیار !!

کے مصداق ان کا اس وقت کا سب و شتم بعد میں نقصان دہ ہی ثابت ہو گا مفید نہیں!---اس اعتبار سے ہمارے نزدیک مسٹر دولتانہ کی سیاسی حکمت عملی بہت صحیح ہے اور وہ لوگ سخت غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں جو حد سے زیادہ بڑھی ہوئی مجیب دشمنی کے جوش میں خود مسٹر دولتانہ کو بھی مسلسل رگڑے چلے جا رہے ہیں۔

دوسری طرف مغربی پاکستان میں بھی اگرچہ دائیں بازو کی سیاسی قوت تو بہت زیادہ منتشر و منقسم ہے لیکن شخصی اعتبار سے واقعہ یہ ہے مسٹر دولتانہ کے قد کاٹھ (STATURE) کا کوئی دوسرا سیاست دان ریٹائرڈ لوگوں میں ہو تو ہو کم از کم میدان میں موجود نہیں۔ اس اعتبار سے "نظریۂ پاکستان" کی علمبردار تمام جماعتوں کے لئے مناسب یہی ہے کہ وہ ان کی شخصیت کو ذہنی طور پر قبول (RECONCILE) کرنے کا کڑوا گھونٹ جیسے تیسے بھر ہی لیں اور ماضی کی تلخ یادوں کو بھلا کر ان سے مفاہمت کر لیں۔ خاص طور پر لیگ ہائے ثلاثہ کو تو اگر وہ واقعتاً اپنے مبینہ اغراض و مقاصد اور نظریات کے ساتھ مخلصانہ تعلق رکھتی ہیں، شخصیتوں کے تصادم سے صرفِ نظر کر کے ان کی ذات پر جمع ہو ہی جانا چاہئے----ہماری رائے میں آنجہانی کنونشن مسلم لیگ کا وہ دھڑا جس کی قیادت بظاہر فضل القادر چودھری لیکن درحقیقت سابق صدر ایوب ہی کے ہاتھ میں ہے غالباً جلد ہی اس "نوشتۂ دیوار" کو پڑھ لے گا---رہے خان قیوم تو ان کا معاملہ خالص ذاتی نوعیت کا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ آل پاکستان سطح پر "ابھرنے" کی غرض سے ہر قیمت پر دولتانہ کو گرانے کی کوشش کی بجائے اپنی تمام قوتیں اور توانائیاں صرف سابق صوبۂ سرحد میں علاقہ پرستی کے رجحانات کے مقابلے کے لئے وقف کر دیتے لیکن ع "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!"----اسی طرح کاش کہ پی ڈی پی کے مختلف عناصر میں بھی شخصی سطح سے ابھر کر ملک و ملت کے وسیع تر مفادات کے پیش نظر حقائق کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

رہی جماعت اسلامی اور پیپلز پارٹی تو ہمارے نزدیک اگر ملک کی گاڑی سیاسی پٹڑی پر چلتی رہی اور الیکشن منعقد ہونے کی نوبت آ ہی گئی تو

"ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی"

کے مصداق الیکشن کی ساری رونق انہی کے دم سے ہو گی اور سارا شور و شغب اور ہنگامہ بلکہ سر

پھٹول بھی ان ہی کے مابین ہو گا----واللہ اعلم

واضح رہے کہ مندرجہ بالا تمام گفتگو خالص سیاسی نقطۂ نظر سے تھی----اور اس میں ہم نے حتی الامکان ایک غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے واقعی صورتحال کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے جس میں ہماری پسند یا ناپسند کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔

جہاں تک ہماری ذات کا تعلق ہے، ہمیں اصل دلچسپی تو اگرچہ صرف دین و مذہب اور اس کے مستقبل سے ہے، تاہم چونکہ پاکستان نہ صرف یہ کہ اسلام کے نام پر بنا ہے بلکہ ہمیں فی الواقع یہ محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کا قیام اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی خدائی تدبیر کے سلسلے کی ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا ہمیں دل سے اس کا بقاء و استحکام بھی مطلوب ہے----اور سیاسی جماعتوں میں سے فطری طور پر ریجنل نیشنلزم کے علمبرداروں کے مقابلے میں ہماری ہمدردیاں ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو "نظریۂ پاکستان" کے علمبردار ہیں اور اسلام کا نام بھی لیتے ہیں، چاہے اس کی حیثیت زبانی جمع خرچ سے زیادہ کچھ نہ ہو---- دوسری طرف جو تحریکیں معاشی بے اعتدالیوں اور ناانصافیوں کے مداوا کے طور پر "اجتماعی معیشت" کی علمبردار بن کر اٹھ رہی ہیں، انہیں بھی ہم نہ دشمنِ پاکستان سمجھتے ہیں نہ دشمنِ اسلام ------ بلکہ ہمارے نزدیک مناسب حدود کے اندر رہتے ہوئے یہ بھی وقت کا ایک اہم تقاضا ہے اور ہماری پختہ رائے یہ ہے کہ سیاسی حقوق کے ساتھ ساتھ جب تک عوام کو اپنے جائز معاشی حقوق بھی حاصل نہ ہوں، جمہوریت واقعتاً ایک "گندے انڈے" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

> ہمارے تجزیے کے مطابق ہمارے ملک کے عوام اس وقت جاگیرداری، سرمایہ داری اور نوکر شاہی بیک وقت تین لعنتوں کے چنگل سے نکل کر سیاسی، معاشی اور تہذیبی استقلال سے ہمکنار ہونے کی جدّوجہد کر رہے ہیں اور اس وقت ہم بحیثیتِ ملک و قوم اپنی زندگی کے دو بالکل مختلف ادوار کے مابین ایک عبوری دور سے گزر رہے ہیں!!

اس قسم کے عبوری دور میں جبکہ بہت سے رجحانات بیک وقت متصادم ہوں ایک پیچیدہ

صورتحال کا پیدا ہو جانا بالکل طبعی و فطری ہے اور بھانت بھانت کی بولیاں' شور و شغب اور کسی قدر اونچ نیچ قطعاً غیر متوقع نہیں۔

اس پر مستزاد ہیں بین الاقوامی کھینچ تان اور مختلف عالمی قوتوں کی باہمی رسہ کشی کے اثرات جن سے پیچیدگی دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ ہو جاتی ہے اور حالات مزید نازک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

ہمارے ملک میں اس وقت یہ سارے ہی عوامل کار فرما ہیں اور ان کی پیدا کردہ پیچیدگی ہی کم نہ تھی' لیکن اس میں مزید اضافہ دین و مذہب کے نام کی دہائی کی وجہ سے خواہ مخواہ پیدا کر لیا گیا ہے' در آنحالیکہ اجتماعی زندگی تو بہت دور کی بات ہے' دین و مذہب کو ہماری ایک عظیم اکثریت کی نجی زندگی میں بھی کسی فیصلہ کن عامل کی حیثیت حاصل نہیں۔

اور یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ پاکستان کی موجودہ سیاسی کشمکش میں اسلام ہرگز کسی قابل لحاظ فریق کی حیثیت سے شریک نہیں ہے بلکہ اسے محض ایک سیاسی نعرے کی حیثیت سے استعمال کیا جا رہا ہے!

ہم نے گزشتہ سال کی ابتدائی اشاعتوں میں بھی اس صورتحال کی جانب چند اشارے کئے تھے' لیکن زیادہ تفصیل میں جانا اس لئے مناسب نہیں سمجھا تھا کہ ہماری گزارشات سے حاصل تو کچھ بھی نہ ہو گا البتہ کچھ ایسے بزرگ ضرور ناراض ہو جائیں گے جن کا احترام ہم تہہ دل سے کرتے ہیں۔ لیکن اب دو اسباب کی بنا پر ہمارے لئے اس موضوع پر قلم اٹھانا ضروری ہو گیا ہے :

ایک اس سبب سے کہ ہوتے ہوتے اب اس معاملے نے بہت نازک صورت اختیار کر لی ہے اور ملک کی سیاسی فضا میں اسلام اور سوشلزم کی خیالی جنگ کا کچھ ایسا ہوائی سا سماں باندھ دیا گیا ہے کہ عوام کی اکثریت کے لئے صحیح صورتحال کا فہم نہایت مشکل ہو گیا ہے اور ان میں ایک شدید جذباتی تناؤ پیدا ہو رہا ہے جو کسی بھی وقت خونریز تصادم کی صورت اختیار کر سکتا ہے---- چنانچہ تازہ ترین صورتحال یہ ہے کہ نوبت فتویٰ بازی تک پہنچ چکی ہے اور اس کا ہدف عوام ہی نہیں بالواسطہ طور پر وہ لوگ بھی بن گئے ہیں جن کی دینداری اور تقویٰ کی قسم تک کھائی جا سکتی ہے۔

اور دوسرے اس وجہ سے کہ ہمارے بزرگوں' کرم فرماؤں' دوستوں اور عزیزوں میں سے

بھی بہت سے حضرات نے ان دنوں ہمیں اپنے موقف پر نظر ثانی کرنے کی دعوت دی ہے۔ عام ملاقاتوں اور گفتگوؤں سے قطع نظر ان دنوں پے بہ پے متعدد خطوط میں اس مسئلے کو چھیڑا گیا ہے اور مختلف مشوروں سے بھی نوازا گیا ہے۔ ہمارے لئے ان سب حضرات کے خطوط کا جواب دینا مشکل ہے اور اس کے مقابلہ میں آسان تر صورت یہی ہے کہ ایک بار ہم اس موضوع پر "میثاق" کے صفحات میں مفصل اظہارِ خیال کردیں۔

چنانچہ آئندہ اشاعت میں ہم ان شاء اللہ العزیز اس موضوع پر مفصل کلام کریں گے۔

اللّٰھم ارنا الحقَّ حقًّا وارزقنا اتباعہ وارِنَا الباطلَ باطلًا وارزقنا اجتنابہ!

آمین یاربَّ العٰلمین!!

ماہنامہ "میثاق" کے ۶۸-۱۹۶۷ء کے اداریوں پر مشتمل

ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک اہم تالیف :

اسلام اور پاکستان

جسے بجا طور پر تحریک پاکستان کے تاریخی و سیاسی پس منظر اور اسلامیان پاکستان کے تہذیبی و ثقافتی پس منظر پر ایک جامع و مربوط دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔

قیمت : اعلیٰ ایڈیشن (مجلد)۔/۴۰ روپے اشاعت عام : ۔/۱۶ روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور

باب ششم

تحریکِ پاکستان کی وراثت

اور

"مذہبی رومانویت"

جون جولائی ۱۹۷۰ء

آج سے تین چار ماہ قبل ان صفحات میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ پاکستان کی موجودہ سیاسی کشمکش میں دین و مذہب کو جس طرح اچھالا جا رہا ہے اور اسلام کے نام کو جس طرح ایک سیاسی نعرے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے اس پر بھی مفصل اظہارِ خیال کریں گے اور جتنے مذہبی گروہ اس وقت سیاسی میدان میں برسرِپیکار ہیں ان کے بارے میں بھی اپنی رائے تفصیل کے ساتھ پیش کریں گے۔ گزشتہ شمارے میں یہ وعدہ بوجوہ پورا نہیں کیا جا سکا تھا۔ آج کی صحبت میں ہم اللہ کا نام لے کر اپنے اس وعدے کو پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَظِیْم!

ان تین چار مہینوں کے دوران اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے کہ پاکستانی سیاست کی فضا میں "انقلابی" رنگ مسلسل کم ہوتے ہوتے تقریباً معدوم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ انتخابی رنگ نے لے لی ہے۔

گزشتہ شمارے میں ہم نے پاکستان میں سوشلسٹ انقلاب کے علمبرداروں کی جانب سے کسی انقلابی جدوجہد اور عوامی ایجی ٹیشن کے اجراء کے امکان کا تذکرہ کرنے کے بعد عرض کیا تھا کہ :

> "لہٰذا ہماری استدعا پاکستان کے سوشلسٹ عناصر سے یہی ہے کہ وہ اس آگ سے کھیلنے کی کوشش نہ کریں بلکہ سیدھی طرح سیاسی میدان میں اپوزیشن کا معروف کردار اختیار کر کے ایک مضبوط اور پیہم سیاسی عمل کے ذریعے رائے عامہ کو ہموار کریں ---- اور اس ملک کے سیاسی و معاشی ڈھانچے میں وہ تبدیلیاں برپا کرنے کی کوشش کریں جو انہیں مناسب اور ضروری معلوم ہوں"۔

واقعہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک ملتِ اسلامیہ پاکستان پر اللہ تعالیٰ کے عظیم احسانات میں سے

ایک یہ بھی ہے کہ ------ چاہے اس کے ظاہری اسباب کچھ بھی رہے ہوں اور اس کا Credit کوئی بھی لے لے' بہرحال نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کسی فوری انقلاب کے امکانات تقریباً ختم ہو چکے ہیں اور تمام سیاسی جماعتیں اور سارے سیاسی گروہ پوری دلجمعی کے ساتھ انتخابات کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے ہیں۔

مسٹر بھٹو کے بارے میں ہم نے بارہا عرض کیا ہے کہ وہ خود بھی "انقلابی" سے زیادہ "سیاسی" مزاج رکھتے ہیں اور ان کی تحریک بھی "نظریاتی" سے زیادہ "قومی" رنگ کی حامل ہے---- لہٰذا انہیں تو خالص انتخابی رنگ اختیار کرنے میں کسی دِقّت کے پیش آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ چنانچہ انہیں زیادہ سے زیادہ یہ کرنا پڑا کہ انہوں نے اپنے ڈھیلے ڈھالے جماعتی نظم میں چند "پریشاں روزگار' آشفتہ مغز' آشفتہ ہو" نوجوانوں کو خارج کر کے اصل اہمیت صاحب حیثیت اور ذی وجاہت لوگوں کو دے دی---- اور خود بھی زیادہ گرما گرم اور اشتعال انگیز باتیں کہنی بند کر دیں---- (اگرچہ عوام کے جذبات اور ان کی دلچسپی کے اعتبار سے جو کمی اس طرح واقع ہو سکتی تھی اس کو بعض دوسرے Fire Brand مقررین (جیسے مثلاً ریٹائرڈ میجر جنرل اکبر خاں) کی شعلہ نوائی سے پورا کرنا پڑا!) حد یہ ہے کہ سابق صدر ایوب خاں کے فیلڈ مارشل کے منصب کی بحالی ایسے اقدام پر بھی وہ مہر بلب رہے ؏

"کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں"

ویسے بھی صوبۂ سندھ کی حد تک تو ان کی جماعت یا جمعیت پہلے ہی سے عوام سے زیادہ وڈیروں کے سہارے قائم تھی۔ اب یہ رنگ مزید پختہ ہو گیا ہے اور اندازہ یہ ہے کہ زمینداروں اور جاگیرداروں کی باہمی سیاست میں مسٹر بھٹو آنے والے انتخابات میں کھوڑو اور قاضی فضل اللہ گروپ کا بھرپور مقابلہ کریں گے اور کیا عجب کہ انہیں شکست دینے میں بھی کامیاب ہو جائیں۔

البتہ مولانا بھاشانی کا معاملہ بہت مختلف تھا اور ان کیلئے یہ قلب ماہیت اتنی آسان نہ تھی۔ چنانچہ ان کی گاڑی کو پٹڑی بدلتے ہوئے بہت سے شدید جھٹکے کھانے پڑے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کانفرنس تک ان کا "انقلابی" رنگ پوری طرح قائم تھا اور اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس وقت تک وہ کلیتاً اپنی جماعت کے' خصوصاً مشرقی پاکستان کے انتہا پسند عناصر کے زیر اثر تھے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ان کی آتش نوائی ان کے مغربی پاکستانی ساتھیوں کی اکثریت کو پسند نہیں آئی۔ ادھر مشرق میں

ایک قابل لحاظ عنصر انتخابات کے حق میں زور لگا رہا تھا۔ چنانچہ ان کی جماعت میں ان تین چار ماہ کے دوران بڑی رسہ کشی اور کھینچا تانی رہی------اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی اعلان کردہ ملک گیر ہڑتال کی ناکامی میں جہاں خارجی اسباب کا دخل تھا وہاں اصل فیصلہ کن دخل اسی داخلی انتشار کو حاصل تھا۔

ہڑتال کی ناکامی کے بعد اس کشمکش میں رفتہ رفتہ سیاسی عنصر کا پلڑا بھاری ہو گیا اور مولانا بھاشانی نے پیڑی بدلنی شروع کر دی۔ چنانچہ ایک طرف تو ایسٹ پاکستان نیپ کے انتہا پسند انقلابی عناصر جن کے سرخیل مسٹر ظفر تھے پارٹی سے کٹ گئے---اور دوسری طرف مولانا بھاشانی نے جو "انقلابی سٹیم" انقلابی جدوجہد کی تیاریوں کے دور میں کارکنوں میں بھر دی تھی اسے چند بے ضرر سے "گھیراؤں" میں نکلوا کر پارٹی کے انقلابی انجن کو ٹھنڈا کر دیا---اور اس ڈرامے کا ڈراپ سین اس طرح ہوا کہ مولانا خود بیمار ہو کر پارٹی کونسل کے اجلاس سے غیر حاضر ہو گئے اور کونسل نے ایک طرف انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کر کے اپنی قلبِ ماہیت کا اعلان کر دیا اور دوسری طرف مولانا بھاشانی کو تیسری بار پارٹی پریذیڈنٹ منتخب کر کے ان کی شخصیت کو بھی مجروح ہونے سے بچا لیا۔

اس طرح اصولی اعتبار سے تو اب نیشنل عوامی پارٹی کے دونوں گروپوں کے مابین کوئی فرق نہیں رہا' ماسوائے اس کے کہ بھاشانی گروپ "تازہ واردِ بساطِ سیاست" ہونے کی وجہ سے ابھی قدرے زیادہ "نظریاتی" ہے' جبکہ ولی خاں گروپ ایک عرصے سے اس دشت کی بادیہ پیمائی کر رہا ہے لہٰذا قدرے زیادہ "سیاسی" ہے۔ لہٰذا ہماری رائے میں اگر ان دونوں گروپوں کے لیڈر ذاتیات سے بلند ہو سکیں تو اب جلد ہی انہیں دوبارہ باہم مدغم ہو جانا چاہئے----واللہ اعلم!

بہرحال بھٹو اور بھاشانی کے سیاسی و انتخابی لائن اختیار کر لینے سے پاکستان کے سر سے کسی فوری دھماکہ خیز انقلاب کا خطرہ ٹل گیا ہے اور سارا کھیل خالص سیاسی نوعیت کا رہ گیا ہے----فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ!!

ان تین چار ماہ کے دوران میں اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی پاکستان میں پورے زور و شور سے اور مشرقی پاکستان میں کسی قدر کم قوت کے ساتھ' تحریک پاکستان کا گویا از سرِ نو احیاء ہو گیا ہے' چنانچہ ایک طرف مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور نظریۂ ملی کا راگ خوب الاپا جا رہا ہے۔ دوسری

طرف "نظریۂ پاکستان" کی دہائی دی جارہی ہے اور اس کے تحفظ کیلئے سرمایہ داروں کی تجوریوں کے منہ کھل گئے ہیں اور تیسری طرف اسلام' اسلام کا شور مچ رہا ہے اور بہت سے خوش گمان لوگوں کی آنکھوں میں اسلامی نظام کے نفاذ اور اسلامی حکومت کے قیام کی امیدوں کے سوکھے چمن میں یکبارگی بہار کی آمد کے خیال سے چمک پیدا ہو گئی ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ اس تازہ احیاء شدہ "تحریکِ پاکستان" کے دلِ صدپارہ کے کچھ ٹکڑے کسی کے قبضے میں ہیں اور کچھ کسی دوسرے کے ہاتھ ---- چنانچہ ایک طرف تحریکِ پاکستان کی "مذہبی رومانویت" ہے جس پر کم از کم تاحال بلا شرکتِ غیرے پوری مضبوطی کے ساتھ جماعت اسلامی قابض ہے اور اس میں وہ کسی کو بھی شریک کرنے کو تیار نہیں۔ حتیٰ کہ اس کے اصل وارثین میں سے ایک گروہ جو علماء دیوبند کے تھانوی و عثمانی حلقوں پر مشتمل ہے نہ صرف پورا زور صرف کرنے بلکہ چھینا جھپٹی کرنے کے باوجود جماعت اسلامی کو اس "قبضۂ غاصبانہ" سے بے دخل کرنے میں ناکام ہو رہا ہے۔ اور اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا تھانوی کی طرف سے اس سلسلے کی مزید کارروائی کے سدِباب کیلئے غالباً جماعت اسلامی متحدہ اسلامی محاذ کے قیام کیلئے گفت و شنید تک سے احتراز کرے گی ---- حال ہی میں تحریک پاکستان کی مذہبیت کی وراثت کا دعویدار ایک دوسرا گروپ البتہ ایسا سامنے آیا ہے جو چاہے جماعت اسلامی کو اس "قبضۂ غاصبانہ" سے کلی طور پر بے دخل نہ کر سکے' بہرحال اس میں سے قابلِ لحاظ حصہ ضرور بٹوالے گا' ہمارا اشارہ بریلوی مکتب فکر کے علماء اور مشائخ کی اس کانفرنس کی جانب ہے جو حال ہی میں "دارالسلام" ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بڑی شان و آن بان کے ساتھ منعقد ہوئی ہے اور جس میں متعدد مقررین نے جماعت اسلامی پر شدید لے دے کی ہے۔

دوسری طرف اس "مذہبی رومانویت" کے بالکل برعکس تحریک پاکستان کے اصل اور اساسی محرک یعنی ہندوؤں کے سیاسی' تہذیبی اور معاشی تسلط کے خوف اور اس سے بچاؤ کے جذبے کی وراثت ہے جس پر اتفاقاً ہی سہی بہرحال کم از کم مغربی پاکستان کی حد تک کلیتاً مسٹر ذوالفقار علی بھٹو قابض ہو گئے ہیں۔ تحریک پاکستان کا یہ اصل "باطن" اس وقت دو صورتوں میں ظاہر ہو رہا ہے : ایک ہندوستان دشمنی اور دوسرے عوام کے معاشی حقوق کی بازیافت کی جدوجہد۔ ان میں سے مقدم الذکر کی علامت (Symbol) تو مسٹر بھٹو ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران ہی میں بن گئے تھے

اور مؤخر الذکر کی علامت وہ اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگا کر بن گئے۔ اور چونکہ ایک طرف یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ تحریک پاکستان کے اساسی محرکات میں اصل فیصلہ کن حیثیت معاشی عوامل ہی کو حاصل تھی اور دوسری طرف اس حقیقت کا انکار بھی شدید قسم کی ڈھٹائی کے بغیر ممکن نہیں کہ اسلامی سوشلزم کا تصور "مصورِ پاکستان" علامہ اقبال کے یہاں تو پورے زور و شور کے ساتھ موجود ہے ہی' خود "خالقِ پاکستان" مسٹر محمد علی جناح اور ان کے دستِ راست خان لیاقت علی خاں کے یہاں بھی بصراحت مذکور ہے (اور یہ تو شاید پرانی باتیں معلوم ہوں---- تازہ ترین انکشاف یہ ہے کہ اس خط میں جو محترمہ فاطمہ جناح نے اپنی انتخابی مہم کے دوران بی ڈی ممبروں کو بھیجا اور جسے گویا ان کے چھوٹے سے منشور کی حیثیت حاصل تھی' محترمہ فاطمہ جناح نے ٹیپ کا بند یہی ارشاد فرمایا تھا کہ : "... تاکہ ... ہماری آئندہ نسلیں اپنی زندگی اسلامی سوشلزم اور ان اصول و نظریات کے مطابق گزار سکیں جن کی بنیاد پر ہماری عظیم مملکت پاکستان وجود میں آئی ہے..." ع "چیست یارانِ طریقت بعد ازیں انکارِ ما") لہٰذا چاہے یہ کسی کو برا لگے چاہے بھلا' بہرحال واقعہ یہی ہے کہ تحریک پاکستان کی اصل روح باطنی کے وارث مسٹر بھٹو ہیں (اگرچہ مغربی پاکستان میں ہندوستان دشمنی کی راہ سے خان عبدالقیوم خاں اور مشرقی پاکستان میں اس خطے کے معاشی حقوق کی بازیافت کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے شیخ مجیب الرحمٰن بھی تحریک پاکستان کے اس جزو کی وراثت میں کسی حد تک شریک قرار دیئے جاسکتے ہیں۔)

تیسری طرف تحریک پاکستان کے اس "جسدِ خاکی" کی وراثت کا مسئلہ ہے جو نواب زادوں' جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں سے مرکّب تھا اور دین و مذہب کے باب میں زیادہ سے زیادہ "لبرل اسلام" کا قائل تھا۔ اور اگرچہ مسلم لیگ بطور ایک وحدت کے تو کبھی کی مرحومین کی فہرست میں شامل ہو چکی تاہم اس کے جسدِ خاکی کے اجزاء ابھی موجود ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ ٹھنڈے پیٹوں ہرگز اس بات کو برداشت نہیں کرسکتے کہ ان کے ہوتے ہوئے کوئی دوسری جماعت زبردستی تحریک پاکستان کی وراثت پر تنہا قابض ہو جائے اور مسلم لیگ کی واحد جانشین بن بیٹھے' اس لئے کہ بظاہر احوال تو تحریک پاکستان کی وراثت کے اصل مدعی وہ ہیں نہ کہ کوئی اور! (مسلم لیگ کے "باقیات الصالحات" ہونے کی حیثیت سے تحریک پاکستان کی وراثت کے دعوے داروں میں فی الوقت مدّعیٔ اعظم کی حیثیت بلاشبہ مسٹر ممتاز محمد خاں دولتانہ اور ان کے ساتھیوں کو حاصل ہو گئی

ہے۔ اگرچہ کچھ دوسرے گروپوں کا دعویٰ بھی اس بات میں بالکل بے بنیاد قرار نہیں دیا جاسکتا۔)

قصہ مختصر یہ کہ ---- اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت پاکستان میں تحریک پاکستان کے احیاء کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے لیکن چونکہ تحریک پاکستان کے حصے بخرے ہو چکے ہیں اور ع

"اڑائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے"

کے مصداق اس کی وراثت کے مدعی بہت سے ہیں' لہٰذا چاہے "تحفظِ نظریۂ پاکستان" کے نام پر بھیک کسی ایک جماعت ہی کو زیادہ مل جائے' انتخابات کے میدان میں تحریک پاکستان کے اس حالیہ احیاء کے ثمرات بہت سی سیاسی جماعتوں کے مابین تقسیم ہوں گے اور کوئی ایک جماعت چاہے وہ کوئی سی بھی ہو ان سے بلا شرکتِ غیرے متمتع نہیں ہو سکتی!----!!

"مذہبی رومانویت" کی اصطلاح ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں کے لئے بالکل اجنبی ہو اور وہ اس سے ناخوش بھی ہوں' اس لئے وضاحتاً عرض ہے کہ یہ "ایجادِ بندہ" نہیں ہے بلکہ سب سے پہلے اس اصطلاح کو مسلم ہندوستان کے زمانۂ حاضر کے سب سے بڑے مؤرخ شیخ محمد اکرام صاحب نے مسلمانانِ ہند کی ماضیٔ قریب کی تاریخ کے اس دور کی کیفیت کی تعبیر کیلئے استعمال کیا تھا جس میں مسلمانوں کی قیادت کچھ صحافی قسم کے لیڈروں کے ہاتھ آگئی تھی جنہوں نے ملّتِ اسلامیہ ہند کو حقائق کا مواجہہ (Face) کرنے کی بجائے تصورات و جذبات کی دنیا میں رہنا سکھایا اور گویا زمین پر قدم بہ قدم چلانے کی بجائے ہوا میں اڑایا اور فضا کی پہنائیوں کی سیر کرائی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بجائے اس کے کہ قوم میں محنت و مشقت' ایثار و قربانی اور جُہدِ مسلسل و سعی پیہم کا مادہ پیدا ہوتا اسے اکثر و بیشتر تصورات کے حسین خوابوں کی دنیا میں کھوئے رہنے اور کبھی کبھی ہڑبڑا کر اٹھنے اور جوش و ہیجان میں کچھ نعرے لگا کر پھر خوابِ خرگوش میں مبتلا ہو جانے کی عادت پڑ گئی۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم کا "کامریڈ" اس مرض کی صرف ابتدائی علامات کا مظہر تھا---- مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے "الہلال" اور "البلاغ" میں یہ مرض اپنی پوری شدت کو پہنچا اور وہیں سے اس کی چھوت مولانا

ابوالاعلیٰ مودودی کو لگی جنہوں نے "ترجمان القرآن" کے ذریعے اس طرز کی صحافیانہ قیادت کے تسلسل کو برقرار رکھا---اور یہ تو اس "سلسلۃ الذہب" کی صرف متصل کڑیاں ہیں۔ ان کے علاوہ ملک کے طول و عرض میں اس کی اور بھی شاخیں پھوٹیں۔ جیسے مولانا ظفر علی خاں مرحوم کا "زمیندار" وقس علیٰ ہذا۔

اس صحافیانہ قیادت نے ایک طرف مسلمانوں کو ان کی عظمتِ رفتہ کی داستانیں سنا کر شاد کام کیا اور "پدرم سلطان بود" کے نشے میں مبتلا کر دیا اور دوسری طرف حکومتِ الٰہیہ کے قیام اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے بلند ترین نصب العین عطا کئے لیکن اس کے لئے کسی عملی نہج کو نہ واضح کیا نہ اس کی داغ بیل ڈالی۔ نتیجتاً پوری قوم پر مذہبی رومانویت کی سی کیفیت طاری ہو گئی جس کا تعلق ہوش سے زیادہ جوش اور عمل سے زیادہ تصور سے تھا۔

مولانا ابوالکلام مرحوم نہایت ذہین آدمی تھے۔ انہوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ یہ سب ہوائی رومان ہے' حقائق سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ نتیجتاً انہوں نے جلد ہی قیامِ حکومتِ الٰہیہ کے "آسمانی" نصب العین سے دست کش ہو کر غیر ملکی سامراج سے آزادی کے حصول کا حقیر سا "زمینی" نصب العین اختیار کر لیا۔ اور بقیہ زندگی خاموشی کے ساتھ اس کی تحصیل میں کھپا دی ------اس موقع پر مولانا مودودی آگے بڑھے اور انہوں نے مولانا ابوالکلام کو ان کی زندگی ہی میں مرحوم قرار دے کر ان کے چھوڑے ہوئے مشن کو سنبھال لیا اور اس مذہبی رومان میں مزید رنگ آمیزی شروع کر دی۔ لیکن "بدقسمتی" سے اسی زمانے میں مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک زور پکڑ گئی اور اس نے حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے مذہبی رومان کی قیادت خود سنبھال لی اور اسلامی تہذیب' اسلامی تمدن' اسلامی قانون وغیرہ اصطلاحات کا استعمال کثرت سے شروع کر دیا اور اس طرح وہ "مذہبی رومانویت" کم از کم وقتی طور پر مسلم لیگ کے قبضے میں چلی گئی۔ تب مولانا مودودی نے یہ کہہ کر کہ اس قسم کی قومی تحریکوں سے کبھی اسلامی حکومت قائم نہیں ہو سکتی {۱} اس کا تو بس

{۱} "اس خام خیالی (LOOSE THINKING) کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ بعض سیاسی و تاریخی اسباب سے کسی ایسی چیز کی خواہش تو پیدا ہو گئی ہے جس کا نام "اسلامی حکومت" ہو' لیکن خالص علمی (SCIENTIFIC) طریقہ پر نہ تو یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کی نوعیت کیا ہے اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ کیونکر قائم ہوتی ہے..."

اقتباس از "اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے" تحریر مولانا مودودی

"ایک ہی مخصوص" طریقہ ہے' مسلمانوں کی قومی تحریک سے علیحدگی اختیار کرلی اور اس "ایک ہی مخصوص" طریق {۲} پر کام شروع کردیا۔

۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک مسلم لیگ نے مسلمانانِ ہند کی اس مذہبی رومانویت کو خوب استعمال (Exploit) کیا۔ اور اس کے بل پر اپنی اس حیثیت کو تسلیم کرالیا کہ وہ مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ یہی وہ وقت تھا جبکہ بریلوی مکتب فکر کے علماء و مشائخ کی ایک بڑی تعداد اور دیوبندی مکتب فکر کے تھانوی اور عثمانی حلقے اس رومانی غبارے میں مزید ہوا بھرنے کے لئے میدانِ عمل میں آ گئے ---- چنانچہ اسی بنا پر ہم نے سطورِ بالا میں ان ہی دونوں حلقوں کو تحریکِ پاکستان کی مذہبی رومانویت کی وراثت کے حقیقی دعویدار قرار دیا ہے۔ لیکن رومان بہرحال رومان ہی ہوتا ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد جلد ہی اس حسین خواب کا بھانڈہ چوراہے میں پھوٹ گیا اور یہ محسوس ہونے لگا کہ ع خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا!" ------ لیکن ابھی اس غبارے کی پوری گیس نکلنے نہیں پائی تھی کہ مولانا مودودی اپنے اس "ایک ہی مخصوص طریق کار" کو چھوڑ چھاڑ مذہبی رومانویت کے اس غبارے میں از سرِ نو گیس بھرنے کے لئے میدان میں آ گئے۔ اول

{۲} اس مخصوص طریق کار کے ابتدائی ناگزیر لوازم (PRE-REQUISITES) کا بیان مودودی صاحب ہی کے الفاظ میں سنئے :

"درحقیقت اسلامی حکومت کسی معجزے کی شکل میں صادر نہیں ہوتی۔ اس کے پیدا ہونے کے لئے ناگزیر ہے کہ ابتدا میں ایک ایسی تحریک اٹھے جس کی بنیاد میں وہ نظریہ حیات' وہ مقصد زندگی' وہ معیار اخلاق' وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہو۔ اس کے لیڈر اور کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو اس خاص طرز کی انسانیت کے سانچے میں ڈھلنے کے لئے مستعد ہوں ---- پھر وہ اپنی جدوجہد سے سوسائٹی میں اسی ذہنیت اور اسی اخلاقی روح کو پھیلانے کی کوشش کریں ---- پھر اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کا ایک نیا نظام لے کر اٹھے جو اس مخصوص ٹائپ کے آدمی تیار کرے۔ اس سے مسلم سائنٹسٹ' مسلم فلسفی' مسلم مورخ' مسلم ماہرین سیاست' غرض ہر شعبہ علم و فن میں ایسے آدمی موجود ہوں جو اپنی نظر و فکر کے اعتبار سے مسلم ہوں' جن میں یہ قابلیت ہو کہ افکار و نظریات کا ایک پورا نظام اور عملی زندگی کا ایک مکمل خاکہ اسلامی اصولوں پر مرتب کریں اور جن میں اتنی طاقت ہو کہ دنیا کے خدا ناشناس ائمہ فکر کے مقابلے میں اپنی عقلی و ذہنی قیادت (INTELLECTUAL LEADERSHIP) کا سکہ جمادیں...."

(ایضاً)

اول انہیں اپنی اس کوشش میں بری طرح ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن ع "پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ!" کے مصداق وہ تندہی کے ساتھ کام میں لگے رہے تا آنکہ آج نہ صرف یہ کہ پاکستان میں تحریک پاکستان کی مذہبی رومانویت کا از سرِ نو دور دورہ ہے بلکہ اس کی وراثت پر جماعت اسلامی اس طرح قابض ہے کہ اس کے اصل اور جائز وارثوں تک کو اپنا جائز حق وصول کرنا اور جماعت اسلامی کو اس "قبضۂ غاصبانہ" سے بے دخل کرنا مشکل نظر آرہا ہے!!-----!!

تاہم جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں "قیادتِ پاکستان" کے خواب کی تعبیر ابھی کہیں آس پاس بھی نظر نہیں آتی۔ اس لئے کہ اول تو تحریک پاکستان کی مذہبی رومانویت کے جائز وارث بھی میدان عمل میں آگئے ہیں اور دوسرے اس تحریک کے بعض دوسرے اجزاء بھی تھے جن کی وراثت دوسروں کو منتقل ہو چکی ہے-----الغرض ع "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!"

پاکستان کے سیاسی میدان میں اس وقت جو مذہبی گروہ یا جماعتیں برسرِ کار ہیں ان میں سب سے نمایاں تو جماعت اسلامی ہی ہے' دوسرے نمبر پر جمعیت علمائے اسلام ہے جس کی قیادت مولانا درخواستی' مفتی محمود اور مولانا ہزاروی کر رہے ہیں-----اور ان کے بعد چند متفرق مذہبی گروہ ہیں جو مسلک و مزاج کے اعتبار سے چاہے کتنے ہی مختلف ہوں سیاسی موقف کے اعتبار سے ملّتِ واحدہ ہیں' یعنی مرکزی جمعیت علماء اسلام' جمعیت اہل حدیث اور بریلوی مکتب فکر کے علماء و مشائخ کے مختلف گروپ۔

ان میں سے جہاں تک مؤخر الذکر متفرق گروہوں کا تعلق ہے ہمیں ان کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں کہنا۔ اس لئے بھی کہ سیاست ان کا مستقل مشغلہ نہیں ہے بلکہ سیاست سے ان کی دلچسپی صرف موسمی (SEASONAL) قسم کی ہے۔ ان کا اصل اور مستقل شغل درس و تدریس اور اپنے اپنے ہم خیال فرقوں کی مذہبی پیشوائی ہے جس کے ذیل میں مدارس و مکاتیب کے قیام و اہتمام' مساجد کی امامت اور اپنے اپنے مخصوص عقائد کی تبلیغ و تلقین میں یہ حضرات پوری طرح مصروف رہتے ہیں اور اس لئے بھی کہ ان کی یہ موسمی سیاست بھی تضادات اور قلابازیوں سے خالی

ہے ------ آج سے پچیس سال قبل بھی یہ حضرات قومی سیاست کا مذہبی ضمیمہ بن گئے تھے ----- اور آج پھر انہوں نے یہی رول اختیار کر لیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُس وقت قومی سیاست کی علمبردار جماعت ایک ہی تھی۔ لہٰذا یہ سب متفقہ طور پر اس کے معاون و مددگار بن گئے تھے اور اب قومی سیاست کئی دھڑوں میں بٹی ہوئی ہے لہٰذا ان کا تعاون بھی منقسم ہو جائے گا' چنانچہ ان کی اکثریت تو مرحوم مسلم لیگ کے صُلبی وارثوں کے مختلف گروہوں ہی کی مدد کرے گی۔ ایک قدرِ قلیل شاید تحریکِ مسلم لیگ کی معنوی وارث یعنی جماعت اسلامی کا ساتھ دے دے ----- اسلام اور سوشلزم کی ہوائی جنگ میں چونکہ ان سب گروہوں نے متفقہ طور پر جماعت اسلامی کا ساتھ دیا تھا لہٰذا جماعت اسلامی کو توقع ہو گئی تھی کہ شاید انتخابات میں بھی وہ ان سب کی متفقہ حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے لیکن جونہی وہ ہوائی جنگ ختم ہوئی اور انتخابات کی بساط بچھنی شروع ہوئی اس متحدہ اسلامی محاذ کے شرکاء کے رخ بھی تبدیل ہونے شروع ہو گئے حتیٰ کہ اب اتحاد و اتفاق کے لئے کبھی کراچی اور کبھی لاہور میں مذاکرات تو منعقد ہوتے رہتے ہیں لیکن بات نہ کسی طور بن رہی ہے نہ بن سکے گی۔ اور ہمارے اندازے کے مطابق مولانا احتشام الحق تھانوی کی مرکزی جمعیت علماء اسلام بالواسطہ یا بلاواسطہ کونسل مسلم لیگ کا ساتھ دے گی اور بریلوی مکتبِ فکر کے علماء اور مشائخ کی اکثریت اپنے اپنے علاقوں میں لیگ ہائے ثلاثہ میں سے زیادہ تر دوسری دو مسلم لیگوں سے منسلک زمینداروں اور جاگیرداروں کے ہاتھوں کو مضبوط کرے گی جبکہ جمعیتِ اہل حدیث کی تازہ نوجوان قیادت اور جمعیت علماءِ پاکستان کے صرف نعیمی گروپ کی حمایت جماعت اسلامی کو حاصل ہو جائے گی ------ واللہ اعلم!!

پاکستان کے سیاسی میدان کے اصل اور مستقل مذہبی کھلاڑی درحقیقت دو ہی ہیں یعنی جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام اور اگرچہ فی الوقت یہ دونوں بالکل مخالف کیمپوں سے تعلق رکھتے ہیں اور اکثر معاملات میں ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں تاہم ان دونوں کے مابین بعض امور مشترک بھی ہیں :

مثلاً ایک یہ کہ قبل از تقسیمِ ملک و قیامِ پاکستان ان دونوں کی راہیں مسلمانانِ ہند کی مجموعی قومی سیاست سے جدا تھیں ------ ایک گروپ کانگریس کا حامی و حلیف تھا اور دوسرے نے اپنی

ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بالکل ہی الگ بنائی تھی (اگرچہ اس اتفاق میں بھی اختلاف کا ایک رنگ موجود تھا یعنی یہ کہ مودودی صاحب نے ابتدا میں کچھ عرصے تک کم از کم نظری اور کاغذی حد تک قومی سیاست کا ساتھ دیا تھا ---- اور اس زمانے میں جمعیت علماء ہند کے موقف پر شدید اور نہایت تلخ تنقیدیں کی تھیں جن کی یاد فریق ثانی کے ذہن سے کسی طرح محو نہیں ہو سکتی!)

دوسرے یہ کہ قیام پاکستان کے بعد یہاں کی قومی قیادت کے مقابلے میں بھی ان دونوں کا رویّہ ایک جیسا رہا اور دونوں نے ہر ممکن طریق پر قومی قیادت کو کمزور کرنے کی کوشش کی، صرف اس فرق کے ساتھ کہ جبکہ جماعت اسلامی نے بزعمِ خویش قومی قیادت کے حریف کی پوزیشن سنبھال لی تھی اور وہ اس کی جگہ لینے کے لئے مثبت طور پر جارحانہ پیش قدمی کر رہی تھی وہاں جمعیت اور اس کے ہم خیال علماء کی روش اکثر و بیشتر صرف عدم تعاون اور ترکِ موالات کی قسم کی PASSIVE RESISTANCE تک محدود رہی، تاہم نتیجہ تقریباً ایک ہی رہا اور اکثر معاملات میں یہ دونوں گروہ، چاہے برضا و رغبت چاہے بادلِ ناخواستہ ایک دوسرے سے تعاون کرتے رہے، چنانچہ اینٹی قادیانی موومنٹ میں جماعت کو مجبوراً احرار اور جمعیت علماء اسلام کے پیچھے لگنا پڑا..... اور دوسری طرف پاکستان کے پہلے دس گیارہ سالوں کے دوران اسلامی دستور و قانون کے نفاذ کے مطالبے اور دوسری دہائی کے دوران سابق صدر ایوب خاں کی مخالفت میں اکثر جمعیت جماعت کا ساتھ دیتی رہی حتیٰ کہ بعض مواقع پر تو حیرت انگیز حد تک اشتراکِ عمل رہا۔ مثلاً ۱۹۶۷ء میں عید الفطر کے موقع پر اور ۱۹۶۸ء کے اواخر میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے خلاف ایجی ٹیشن میں۔

تیسرے یہ کہ دونوں ہی نے احیائے دین اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے باب میں صرف نعروں پر اکتفا کی اور اس کے لئے کسی مثبت تعمیری کام کی داغ بیل نہیں ڈالی۔ اس سلسلے میں زیادہ ذمہ داری جماعت اسلامی پر عائد ہوتی ہے اور اصل گلہ اسی سے ہے، اس لئے کہ جیسا کہ سطور بالا میں دیئے ہوئے اقتباس سے ظاہر ہے وہ علمی و فکری انقلاب ہی کے نام پر قومی تحریک سے علیحدہ ہوئی تھی اور واقعہ یہ ہے کہ اس کی کسی حد تک صلاحیت بھی اس نے اپنے اندر قیام پاکستان سے قبل کے پانچ چھ سالوں میں پیدا کر لی تھی ---- لیکن افسوس کہ قیام پاکستان کے بعد اس نے ساری صلاحیتوں اور قوتوں کو سیاسی میدان میں جھونک دیا۔ رہی جمعیت علماء تو اس غریب نے نہ کبھی اس کا دعویٰ کیا اور [illegible] ایسے کسی کام کی صلاحیت ہی ہے!! لہٰذا اس

سے نہ کبھی اس کی کوئی توقع تھی نہ اب کوئی گلہ ہے!-----!!

ان چند مابہ الاشتراک امور کے سوا ہر اعتبار سے پاکستانی سیاست کے اکھاڑے کے یہ دونوں مذہبی پہلوان ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں اور ہوتے ہوتے ان کے عناد اور بغض نے انتہائی خطرناک صورت اختیار کرلی ہے' حتیٰ کہ اب جس شدید نوعیت کی عداوت ان دونوں کے مابین ہے اس کی مثال نہ دوسری سیاسی جماعتوں میں مل سکتی ہے نہ مذہبی گروہوں میں۔

سیاسی امور میں ان کے مابین جو بُعد المشرقین پایا جاتا ہے اس کے تذکرے سے قبل اس حقیقت کی جانب اشارہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان دونوں کا مذہبی رنگ بھی ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔ کسی گزشتہ اشاعت میں ہم ضمنی طور پر حاشیے میں یہ جملہ لکھ بیٹھے تھے کہ "جماعت اسلامی کا مذہبی رنگ ہلکا اور سطحی ہے اور قدامت پسندی اور جدّت پسندی کا ملغوبہ' جبکہ جمعیت علماء اسلام کا مذہبی رنگ نہایت گہرا بھی ہے اور خالص قدیم اور روایتی بھی!" جس پر بہت سے لوگوں حتیٰ کہ ہمارے بعض بزرگوں اور کرم فرماؤں نے بھی ناک بھوں چڑھائی حالانکہ یہ ایک روزِ روشن کے مانند عیاں حقیقت ہے جس کا انکار بالکل آنکھیں بند کرکے ہی کیا جاسکتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ جمعیت علماء اسلام کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو پرانے سند یافتہ اور سکہ بند علماء ہیں اور سالہاسال سے درس وافتاء کی مسندوں پر رونق افروز ہیں۔ پھر کیا یہ حقیقت نہیں کہ جمعیت علماء اسلام کے کارکنوں کی ایک عظیم اکثریت درس نظامی کے فارغ شدہ علماء پر مشتمل ہے یا زیر تعلیم طلبہ پر' جبکہ جماعت اسلامی کی اصل قوت سکولوں اور کالجوں کے تعلیم یافتہ ایسے نوجوانوں پر مشتمل ہے جن کی اکثریت ناظرہ قرآن مجید تو شاید پڑھ لے کسی ایک حدیث کے متن تک کو صحیح نہیں پڑھ سکتی۔ پھر ظاہری وضع قطع اور تراش خراش کے اعتبار سے بھی ان دونوں کے مابین عظیم تفاوت ہے۔ اس سلسلے میں فوری تقابل (SIMULTANEOUS CONTRAST) کا ایک موقع حال ہی میں لاہور میں پیش آیا۔ پچھلے دنوں یہاں ایک جلوس جماعت اسلامی کے زیر اہتمام "اسلام پسندوں" کی قوت کے مظاہرے کے لئے نکالا گیا' اور دوسرا جمعیت علماء اسلام نے اپنی طاقت کے مظاہرے کے لئے نکالا۔ پہلے جلوس کے قائدین میں بھی چار میں سے صرف ایک باریش تھے اور شرکاء میں بھی بمشکل پانچ فی صد داڑھی والے تھے اور ان میں سے بھی زیادہ سے زیادہ ایک

فی صد کی داڑھی فقہی معیار پر پوری اترتی تھی جبکہ دوسرے جلوس کے قائدین اور شرکاء سب کم از کم پچانوے فی صد مکمل شرعی وضع قطع کے حامل تھے۔(ان جلوسوں کے مابین ایک اور نمایاں تفاوت جس کا براہ راست تعلق جماعت اسلامی سے نہیں ہے یہ تھا کہ "شوکتِ اسلام" کے جلوس میں نعرۂ تکبیر پر نعرۂ رسالت حاوی تھا اور کہیں کہیں سے نعرۂ حیدری کی آواز بھی سنی جاتی تھی جبکہ جمعیت علمائے اسلام کے جلوس میں دینی نعروں میں سے نعرۂ تکبیر کے سوا کوئی اور نعرہ سننے میں نہیں آیا)---باقی رہا نظریات و افکار کا معاملہ تو مولانا مودودی خود تجدد پسندوں اور قدامت پرستوں کے مابین "بیچ کی راس" کے آدمی ہونے کے مدعی ہیں جبکہ جمعیت علماء اسلام ہے ہی ان علماء پر مشتمل جن کو قدامت پرستی اور جمود کے طعنے دیئے جاتے ہیں----تو پھر ہم نے اپنے اس جملے میں آخر اور کون ساز ہر گھول دیا تھا؟

سیاسی موقف کے اعتبار سے جماعت اور جمعیت کے مابین جو بُعد المشرقین پایا جاتا ہے' تجزیئے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد تین امور پر قائم ہے :

ایک یہ کہ عالمی سیاست کے میدان میں جمعیت علماء اسلام مغربی سامراج کی جانی دشمن ہے ----- اور اس کی بیخ کنی کے لئے وہ کسی بھی دوسری طاقت سے تعاون کو درست سمجھتی ہے (درحقیقت یہی وہ جذبہ تھا جس کے تحت ماضی میں جمعیت علماء ہند نے انڈین نیشنل کانگریس کا ساتھ دیا تھا) جبکہ جماعت اسلامی کی رائے میں چونکہ مغربی الحاد نے کسی نہ کسی حد تک دین و مذہب کے ڈھانچے کو بھی قائم رکھا ہے اور مغربی جمہوریت میں رائے کی آزادی بھی برقرار رہتی ہے لہٰذا کمیونسٹ بلاک کے مقابلے میں مغربی طاقتیں کم تر درجے کی برائی ہیں۔

دوسرے یہ کہ بین الاسلامی اور خصوصاً بین العرب سیاست میں جمعیت کی تائید اور ہمدردیاں ان ممالک کے ساتھ ہیں جنہوں نے بادشاہتوں کے تختے الٹ کر سوشلسٹ یا نیم سوشلسٹ نظام اختیار کر لئے ہیں ----- اور روس کی امداد کے سہارے مشرقِ وسطیٰ میں امریکی سامراج کے مظہرِ اعظم اسرائیل کے خلاف مصروفِ پیکار ہیں-----جبکہ جماعت اسلامی ان ممالک کی مؤید اور حامی ہے (اور ان کی سرپرستی سے فائدہ بھی اٹھا رہی ہے) جہاں ابھی ملوکیت قائم ہے اور جو سوشلزم کی مخالفت کے پردے میں امریکہ کی حمایت کا دم بھر رہے ہیں۔

تیسرے ملکی سیاست کے میدان میں حال ہی میں دائیں اور بائیں بازو کی جو تقسیم عمل میں آئی ہے اس میں جمعیت علمائے اسلام بائیں بازو کی حامی ہے اور عوام کے معاشی حقوق کی بازیافت کی جدوجہد میں مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ ہے۔ چنانچہ لیبر پارٹی کے ساتھ اس کا باقاعدہ معاہدہ ہو چکا ہے اور بائیں بازو کی دوسری تمام سیاسی جماعتوں کے ساتھ اس کا اتحاد کسی بھی وقت اور کسی بھی صورت میں ممکن ہے---- جبکہ جماعت اسلامی نے سوشلزم کی مخالفت کو اسلام اور کفر کی جنگ کا درجہ دے کر دائیں بازو کی انتہاپسند جماعت کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ چنانچہ ملک کے سرمایہ دار طبقات کو اپنی نجات صرف اسی سے وابستہ نظر آتی ہے اور ان کی تجوریوں کے منہ اس کے "تحفظِ نظریۂ پاکستان فنڈ" کے لئے کھل گئے ہیں۔

بات تو در حقیقت بس اتنی سی ہے جو اوپر بیان ہوئی لیکن شدّتِ مخالفت میں یہی اختلافات اس صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں کہ جماعت اسلامی اور اس کے ہم خیال حلقوں کی جانب سے جمعیت پر کانگریسی مولویوں کی پھبتی کے علاوہ سوشلزم اور کمیونزم کے لیبل ہی نہیں کفر کے فتوے تک چسپاں کئے جا رہے ہیں اور جمعیت کی طرف سے جماعت اور ان کے ہم نواؤں کو امریکہ کے پٹھو، سامراج کے آلۂ کار، یہودیوں کے کارندے اور سرمایہ داروں کے ایجنٹ ایسے خطابات سے نوازا جا رہا ہے۔

جمعیت علمائے اسلام کے بارے میں ہم نے آج سے پورے ڈیڑھ سال قبل جبکہ پاکستانی سیاست کے موجودہ ہنگامہ خیز دور کی ابتدا ہوئی ہی تھی، ان صفحات میں کچھ گزارشات پیش کی تھیں جن سے جمعیت کے متذکرہ بالا سیاسی موقف کے تاریخی پس منظر پر روشنی پڑتی ہے۔ یعنی یہ کہ جمعیت علماء اسلام کا عوامی مزاج اور سامراج دشمن کردار ہرگز "حادث" نہیں بلکہ نہایت قدیم ہے اور اپنی پشت پر ایک طویل تاریخ اور شاندار ماضی لئے ہوئے ہے اور بعض لوگوں کا یہ گمان بالکل بے بنیاد ہے کہ اس کا موجودہ رویّہ صرف جماعت اسلامی کی مخالفت کا نتیجہ یا ذاتی طور پر مولانا مودودی کی دشمنی کی پیداوار ہے۔

مئی ۱۹۶۸ء میں باغ بیرون موچی دروازہ لاہور میں ان کی جو کانفرنس منعقد ہوئی اس کے تقریباً

دو سال اور ایک ماہ بعد پھر ایک عظیم الشان "آئینِ شریعت کانفرنس" لاہور میں جون کے آخری ہفتے میں جمعیت کے زیر اہتمام منعقد ہوئی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے اکابر و عام کارکن دونوں نہایت سخت جان اور واقعتاً آہنی چنوں کے مانند ہیں' اس لئے کہ گزشتہ ایک سال سے ملک کے تمام مذہبی عناصر متحد ہو کر ان کی مخالفت پر کمربستہ رہے ہیں اور انہوں نے ہر ممکن طریقے سے انہیں بدنام کرنے اور عوام کو ان سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی ہے' لیکن ان کے قدم آگے ہی بڑھ رہے ہیں ---- اور تازہ ترین اضافہ یہ ہوا ہے کہ جس طرح جماعت اسلامی گزشتہ تقریباً دس سال سے صدر ناصر اور عالمِ عرب کی عوامی تحریکوں کی دشمنی اور ان کے خلاف شدید زہر آلود پروپیگنڈے کی قیمت عرب بادشاہوں اور امیروں کی "سرپرستی" کی صورت میں وصول کرتی رہی ہے اسی طرح اب جمعیت بھی عرب ممالک کے فریق مخالف کی نگاہوں میں آگئی ہے اور اسے بھی کچھ نہ کچھ "سرپرستی" ضرور حاصل ہو جائے گی۔

ان حضرات پر "کانگریسی مولوی" کی پھبتی سن کر خدا جانتا ہے کہ دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے' اس لئے کہ اس کی اولین زد مولانا حسین احمد مدنیؒ ایسے اکابرِ ملت' مجاہدینِ حریت اور زعمائے دین پر پڑتی ہے جن کے سیاسی موقف سے چاہے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے علم و فضل' تقویٰ و تدین' خلوص و بے نفسی' عزم و ہمت' جانفشانی و تندہی' قربانی و ایثار اور حلم و تواضع کی کوئی دوسری مثال مسلم ہند کی ماضئ قریب کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی ---- مولانا مدنیؒ کی زیارت کا شرف ہماری گنہگار آنکھوں کو تو حاصل نہیں ہوا لیکن ان کی اس "کرامت" کا مشاہدہ ہم نے بچشم سر کیا ہے کہ کتنے ہی مخلص اور متدین لوگوں کی آنکھوں سے ان کا نام سنتے ہی آنسوؤں کا دریا بہہ نکلتا ہے ---- اور حلقہ دیوبند کے مدارس کی وہ زیر تعلیم نوجوان نسل جس نے مولانا کو نہ دیکھا نہ سنا' ان کی توہین پر مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ اور

> ذاتی طور پر ہمارے لئے تو سب سے بڑی شہادت مولانا امین احسن اصلاحی کی ہے جن کے الفاظ میں "مولانا مدنیؒ صرف اپنی سیاسی رائے کے سوا ہر اعتبار سے ایک مثالی شخصیت تھے"۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ بھی ایک مرتبہ مولانا اصلاحی نے سنایا کہ : جن دنوں کانگریس اور

مسلم لیگ کی کشمکش زوروں پر تھی اور مولانا مدنیؒ اور ان کے رفقاء تنقید و استہزاء کا ہدف بنے ہوئے تھے ایک روز خبر آئی کہ کچھ لیگی نوجوانوں نے مولانا کے ساتھ نہایت توہین و تذلیل کا معاملہ کیا..... ان دنوں دارالاسلام سرنا پٹھان کوٹ میں عام معمول یہ تھا کہ شام کے وقت ہم سب لوگ اکٹھے سیر کے لئے نہر پر جایا کرتے تھے (گویا یہ ان دنوں کی مرکز جماعت اسلامی کی شام کی نشست تھی! مدیر) وہاں مولانا مودودی سمیت کچھ لوگوں نے اس خبر پر خوش گپی کے انداز میں تبصرے کرنے شروع کئے' لیکن میں خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد مولانا مودودی نے مجھ سے بھی کچھ کہنے کی فرمائش کی تو میں نے کہا کہ ----"میں اور تو کچھ نہیں جانتا لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ جس قوم نے مولانا مدنیؒ ایسے شخص کی توہین کی ہے اس پر یقیناً کوئی بہت بڑی آفت آنے والی ہے!"----اس پر پوری مجلس پر خاموشی طاری ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد مولانا مودودی نے کہا کہ "مولانا آخر جو لوگ قوم کے احساسات و جذبات کا بالکل لحاظ نہ کریں ان کے ساتھ قوم کبھی گستاخی بھی کر گزرے تو کون سی بڑی بات ہے!" اس پر میں نے مزید تو کچھ نہ کہا لیکن اپنے اس فقرے کو دہرا دیا: "میں اور تو کچھ نہیں جانتا صرف یہ جانتا ہوں کہ جس قوم نے مولانا مدنیؒ ایسے شخص کی توہین کی ہے اس پر یقیناً کوئی بہت بڑی آفت آنے والی ہے!"

ذاتی تقویٰ و تدین کے علاوہ----اب تو ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو ان حضرات کے سیاسی موقف کے بارے میں بھی اپنی رائے پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ خود مولانا احتشام الحق تھانوی نے آج سے تقریباً تین سال قبل جامعہ اشرفیہ لاہور میں جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کچھ ایسے الفاظ کہے تھے کہ "اب جو حالات پیش آ رہے ہیں ان کو دیکھ کر تو خیال ہوتا ہے کہ تحریک پاکستان کے بارے میں ان حضرات کی رائے زیادہ درست تھی جو کہتے تھے کہ پاکستان میں فروغ اسلام کو نہیں' فرقِ باطلہ اور الحاد و اباحیت کو حاصل ہو گا!" لیکن بات یہاں تک نہ پہنچے تو بھی کم از کم اتنا تو ہونا چاہئے کہ اس وقت کی ضدم ضدا میں جو زیادتیاں ایک دوسرے پر ہو گئی تھیں اب کم از کم ان کا اعادہ تو نہ ہو-----

ہم خود اپنا یہ ذاتی احساس بھی اس مقام پر بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتے----کہ بقیہ تمام معاملات اور قیل و قال ایک طرف' کم از کم ہندوستان کے مسلمانوں کے مسئلے کے اعتبار سے تو کبھی کبھی شدت کے ساتھ محسوس ہونے لگتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ کہا تھا کہ "پاکستان کی سکیم سے

ہندوستان کے مسلمانوں کی قوت جو پہلے ہی تہائی ہے وہ تو تین حصوں میں بٹ کر مزید کم ہو جائے گی اور ہندوؤں کی طاقت بالکل یکجا اور مجتمع رہے گی-----!! "ان کا خیال کس قدر درست تھا!!

اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ جب بھی ہندوستان کے مسلمانوں کے کسی تازہ قتل عام کی خبر آتی ہے دوسرے لاکھوں اور کروڑوں حساس مسلمانوں کی طرح راقم الحروف کے دل پر بھی چھریاں چل جاتی ہیں-----اور نہ صرف یہ کہ یہاں کا سکھ چین کاٹ کھانے کو دوڑنے لگتا ہے بلکہ سیدنا مسیحؑ کی تمثیل کے عین مطابق ہر کھانا ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کا گوشت اور ہر مشروب ان کا خون نظر آنے لگتا ہے-----!!

ہمیں دوسروں سے تو کوئی گلہ نہیں لیکن حیرت ناک افسوس ہوتا ہے حلقہ دیوبند ہی کے ان اکابر پر جو نہ صرف درس و افتاء بلکہ تلقین و ارشاد کی مسندوں پر رونق افروز ہوتے ہوئے بھی ایسے کٹھور دل واقع ہوئے ہیں کہ کچھ سیاسی یا رو پہلی مصلحتوں کی بنا پر اب بھی ان خادمانِ دین و ملت پر کانگریسی مولوی ایسی تحقیر آمیز پھبتی کسنے سے باز نہیں رہتے----!!

رہا سوشلسٹ اور کمیونسٹ ہونے کا الزام اور اس کی آڑ میں بالواسطہ کفر کا فتویٰ تو جہاں تک جماعت اسلامی کا تعلق ہے وہ تو' جیسا کہ ہم بعد میں تفصیل سے واضح کریں گے' یہ سب کچھ ایک شدید مجبوری اور اضطرار کے تحت حکمتِ عملی کے طور پر کر رہی ہے' رہے تھانوی و عثمانی حلقے تو ان کی جانب سے یہ معاملہ کچھ تو نا سمجھی میں ہو رہا ہے اور کچھ غالباً مدنی گروپ کے اُس جُرمِ عظیم کے انتقام کے طور پر جو اس نے جمعیت العلماء کی قیادت سے ان حضرات کو بے دخل کر کے "یوسفِ بے کارواں" بنا کر کیا تھا----اس لئے کہ جتنی کچھ سوشلزم کی قائل جمعیت علماء اسلام ہو سکتی ہے اس سے کہیں زیادہ سوشلزم جماعت اسلامی نے بھی حالات سے مجبور ہو کر اپنے منشور میں داخل کر لیا ہے اور تھانوی و عثمانی اکابر کی قیادت میں مختلف مذہبی گروہوں کے ۱۱۸ علماء نے بھی اپنے فتویٰ کے ذریعے اسے سندِ جواز عطا فرما دیا ہے ---- تو ظاہر ہے کہ بنائے نزاع سوشلزم نہیں کچھ اور ہے-----!!

جمعیت کی طرف سے ان ساری مدافعانہ گزارشات کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ خود ان کی اپنی بعض باتوں سے نہ صرف یہ کہ ان کی موجودہ قیادت کے وقار کو دھکا لگا ہے بلکہ ان کے اکابر و اسلاف کی شہرت اور نیک نامی کو بھی نقصان پہنچا ہے۔

ان چیزوں میں سے ایک ان کی شدید بد نظمی و بے ترتیبی ہے جس کی وجہ سے بسا اوقات بڑی ہی مضحکہ خیز صورتیں پیش آتی ہیں اور پوری جمعیت تمسخر و استہزاء کا ہدف بنتی ہے۔ چنانچہ ماضی میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک ہی معاملے میں جمعیت کے ایک لیڈر کا بیان کچھ اور ہوتا ہے اور کسی دوسری مقتدر ہستی کا بالکل کچھ اور ------ اور بالکل وہ کیفیت ہوتی ہے کہ ع

"من چہ می گویم و طنبورۂ من چہ می سراید!"

اگر گستاخی شمار نہ ہو تو ہم جمعیت کے اکابر کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ اس سقم کو جلد از جلد دور کرنے کی کوشش کریں اور تنظیم و جماعت بندی کے کم از کم ناگزیر لوازم کا ضرور اپنے یہاں اہتمام کریں۔

دوسری اور اہم تر چیز جمعیت کے اکابر میں سے بعض کی معیارِ شرافت سے گری ہوئی زبان اور ہلکا طرزِ تکلم ہے جس نے حقیقت یہ ہے کہ جمعیت کو خصوصاً شہروں کی پڑھی لکھی مڈل کلاس کے حلقے میں شدید نقصان پہنچایا ہے۔ ہمیں ان حضرات کے خلوص میں ہرگز کوئی شک نہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے جوش، جذبے اور قوتِ کار کردگی پر رشک آتا ہے، لیکن ان کے طرزِ خطاب اور اندازِ تکلم پر گردن کو ندامت سے جھکا لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا۔ کاش کہ یہ حضرات تقریر و خطاب کے موقع پر "وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ" کی قرآنی ہدایات کو پیش نظر رکھ سکیں اور یہ اندازہ کر سکیں کہ اس کی خلاف ورزی کر کے وہ خود اپنے مقصد اور مشن کو کس قدر نقصان پہنچانے کا سبب بن رہے ہیں۔

تیسری بات یہ کہ اعوان و انصار کے انتخاب میں ان کے یہاں بھی احتیاط ملحوظ نہیں رکھی جاتی بلکہ جس وقت جو شخص مفیدِ مطلب نظر آئے اسے سر آنکھوں پر بٹھا لیا جاتا ہے، حالانکہ اس کا ایک نہایت تلخ قسم کا تجربہ انہیں ماضیٔ قریب میں بھی ہو چکا ہے ------ اس کے علاوہ ان کے جلسوں اور جلوسوں میں بعض اوقات بالکل آوارہ اور اوباش لوگ شریک ہو کر ایسی حرکتیں کرتے ہیں جن سے ہر شریف انسان کو ذہنی کوفت بھی ہوتی ہے اور قلبی اذیت بھی۔ چنانچہ جماعت اسلامی کے "متحدہ

اسلامی محاذ" کا توڑ کرنے کے لئے جو "متحدہ دینی محاذ" جمعیت کے زیر سرپرستی بنا' اس کے جلسے میں نہایت ناگفتہ بہ صورتیں پیش آئیں---اور پھر یوم جہاد کے مشترکہ جلوس میں بھی اس قسم کے عناصر نے جو طرز عمل اختیار کیا اس پر بھی ہر شخص نے نفرین وملامت کی اور اس میں شریک ہونے کی وجہ سے جمعیت کی شہرت کو شدید نقصان پہنچا---ہماری ناچیز رائے میں جمعیت کو ہرگز اس طرح کے سہارے تلاش نہیں کرنے چاہئیں اور جو کام بھی ہو بس اپنی ہی قوت کے بل پر کرنا چاہئے ---اور ہمارا اندازہ ہے کہ غالباً اب جمعیت کے اکابر نے کم از کم اس معاملے میں تو اپنی روش تبدیل کر بھی لی ہے---چنانچہ حالیہ "آئین شریعت کانفرنس" کے موقع کے جلوس و جلسوں میں بحمد اللہ ایسی کوئی صورت پیدا نہیں ہونے پائی' بلکہ جلوس تو بلاشبہ اسلامی متانت' سنجیدگی اور وقار کا ایک عظیم الشان شاہکار تھا---!!

رہی جماعت اسلامی تو اس کا ماضی اگرچہ کچھ زیادہ لمبا چوڑا نہیں' اس لئے کہ اس کا شجرۂ نسب زیادہ سے زیادہ مولانا ابوالکلام مرحوم کے "الہلال" اور "البلاغ" سے ملتا ہے یا خیری برادران سے ---اور اگرچہ مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک سے اس کی علیحدگی کے اسباب کے بارے میں بھی بہت کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہے---تاہم ہمارے نزدیک اس نے جو کام ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء تک کیا وہ درست خطوط پر بھی تھا اور نتیجہ خیز بھی! اور اگر وہ انہی خطوط پر کام کرتی رہتی تو شاید آج اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا خواب "شُد پریشاں خوابِ من...." کی سی مایوس کن صورت پیش نہ کر رہا ہوتا' لیکن افسوس کہ اس نے کچھ وقتی سی ترغیبات (TEMPTATIONS) سے دھوکا کھا کر' جیسا کہ ہم پہلے عرض کر آئے ہیں' خود اپنے بیان کردہ "ایک ہی مخصوص طریق کار" کو تج کر کے پاکستانی سیاست کے اکھاڑے میں کود جانے کا فیصلہ کر لیا---اور تحریک پاکستان کی مذہبی رومانویت کے اس غبارے میں از سر نو گیس بھرنی شروع کر دی جو قیام پاکستان کے بعد تیزی سے خالی (DEFLATE) ہو رہا تھا۔

پھر چونکہ سیاسی میدان میں داخلے کے لئے ان کے پاس سوائے مذہب کے اور کوئی اسناد (CREDENTIALS) سرے سے موجود ہی نہیں تھیں لہٰذا اس میدان کے ہر مقابلے اور حصولِ اقتدار کی جنگ کے ہر معرکے کو انہیں ایک ناگزیر ضرورت کے تحت "اسلام اور کفر کی

جنگ" قرار دینا پڑا---- چنانچہ کم از کم ان کے جرائد و رسائل کے صفحات کی حد تک' پاکستان میں مسلسل تئیس برس سے اسلام اور کفر کی جنگ لڑی جا رہی ہے۔

اول اول اس جنگ میں "کفر" کی جانب سے لڑنے والی اور اسلام کا راستہ روکنے والی وہ قومی قیادت تھی جس میں خواجہ ناظم الدین اور سردار عبدالرب نشتر ایسے پابندِ صوم و صلوٰۃ اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور ڈاکٹر محمود حسین ایسے اسلامی ذہن رکھنے والے لوگ بھی موجود تھے---- جب یہ قیادت کچھ خارجی دباؤ اور کچھ داخلی انتشار کی وجہ سے میدان سے ہٹی تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور گمان کیا کہ اب میدان صاف ہے۔ چنانچہ "حکمتِ عملی" سے کام لیتے ہوئے ۱۹۵۵ء کے سالانہ اجتماع کی قرار دادوں کے ذریعے امریکہ کو بھی سفید جھنڈی دکھادی گئی کہ آپ پریشان نہ ہوں' ہم بھی کوئی غیر نہیں آپ ہی کے نیاز مند ہیں---- لیکن افسوس کہ اُس وقت کی اکھیڑ پچھاڑ اور توڑ پھوڑ میں سے بجائے اس کے کہ ان کے لئے کوئی "خیر کی راہ" نکلتی' الٹا ۱۹۵۸ء کا مارشل لاء اور سابق صدر ایوب خاں کا دس سالہ دورِ اقتدار بر آمد ہو گیا۔ چنانچہ "اسلام اور کفر کی جنگ" کا ایک دوسرا دور شروع ہو گیا۔ اس دور کی ابتدا میں جماعت اسلامی نے ایوب خاں کے بھاری پتھر کو راستے سے ہٹانے کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کی۔ کبھی سہروردی مرحوم سے اشتراک کیا' کبھی محترمہ فاطمہ جناح کی قیادت قبول کی۔ الغرض ع "ہم نے کیا کیا نہ کیا دیدہ و دل کی خاطر!"---- لیکن جب یہ پتھر اپنی جگہ سے ٹس سے مس ہوتا نظر نہ آیا تو تھک ہار کر اپنے قدیم ترین جریدے کے ایک اداریئے کے ذریعے صلح کی پیشکش کی اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا---- لیکن ابھی یہ دوستی صرف گول میز کانفرنس تک ہی پہنچ پائی تھی کہ خود ایوب خاں کا دورِ اقتدار ختم ہو گیا۔

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا!

صرف یہی نہیں بلکہ جس چیز کو مسلسل دس سال تک سب سے بڑا شر اور ساری برائیوں کی جڑ اور اسلام کے راستے کی واحد رکاوٹ ٹھہرایا تھا اس کے ہٹتے ہی ایک اور بلا نمودار ہو گئی----اور ع "شامتِ اعمالِ ماصورتِ بھوگرفت!" کا نقشہ نظر آنے لگا۔ علاوہ ازیں ایک طرف معاشرے کے مظلوم و مجبور طبقے یعنی کسان' مزدور' کم تنخواہ پانے والے سرکاری ملازم اور محنت کش ایک طوفان بن کر اٹھتے نظر آئے اور دوسری طرف "یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کتے!" گلے کو آنے لگے

-----چنانچہ اسلام اور کفر کی جنگ کا ایک نیا معرکہ شروع ہوا-----اور سوشلزم کو کفر کا ایک ہوائی اور فرضی مورچہ قرار دے کر اس پر گولہ باری شروع کر دی گئی۔

اسلام اور سوشلزم -----یا بالفاظ دیگر اسلام اور کفر کی ہوائی جنگ گزشتہ ایک سال سے ہمارے ملک میں پورے زور و شور سے جاری ہے اور اس میں شک نہیں کہ کچھ سرمایہ داروں کی پشت پناہی اور کچھ دوسرے دینی حلقوں کی امداد نے اس جنگ میں خالص سوشلسٹ عناصر کو پسپائی پر مجبور بھی کر دیا ہے لیکن

> برا ہو جمعیت علماء اسلام کا-----کہ وہ اس جیت کو بھی شکست میں تبدیل کرنے پر تل گئی ہے، چنانچہ اس نے ایک طرف مزدوروں، کسانوں اور مظلوم و مقہور عوام کی پشت پناہی شروع کر دی ہے اور دوسری طرف جماعت کی امریکہ نوازی، سامراج دوستی اور سرمایہ داروں کے ساتھ گٹھ جوڑ کا بھانڈہ چوراہے میں پھوڑنا شروع کر دیا ہے-----!!

تو پھر کون سے تعجب کی بات ہے اگر جماعت اسلامی کو سب سے زیادہ غصہ "جمعیت علماء اسلام" ہی پر آئے اور اس کے کارکن اس کے اکابر کا تذکرہ کرتے ہوئے آپے سے باہر ہو جائیں!

ہم واضح طور پر عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ جہاں تک اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی کسی حقیقی امید اور واقعی توقع کا تعلق ہے وہ تو ہمیں نہ جماعت اسلامی سے ہے، نہ جمعیت علمائے سے، اس لئے کہ ان دونوں جماعتوں کا اصل اور حقیقی مزاج سیاسی ہے-----اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے جو کام ناگزیر اور لابدّ منہ ہے یعنی ایک ذہنی و فکری انقلاب-----اور عوام کی اخلاقی و عملی تربیت، وہ ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں کر رہا۔

لیکن جہاں تک ان دونوں مذہبی گروہوں کی سیاسی حکمتِ عملی کا تعلق ہے، ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہمارے نزدیک جماعت اسلامی کا یہ مستقل شغل کہ وہ اپنی حصولِ اقتدار کی جنگ کے ہر معرکے کو اسلام اور کفر کی جنگ بنا کر پیش کرتی ہے اسلام کے حق میں نہایت مضر اور اس ملک میں مذہب کے مستقبل کے اعتبار سے سخت خطرناک ہے-----اس چرواہے کی مانند جو خواہ مخواہ شیر

آیا شیر آیا کہہ کر لوگوں کو امداد کے لئے بلا کر ان کا مذاق اڑایا کرتا تھا' ہمیں اندیشہ ہے کہ ہر وقت اور ہر موقع پر "اسلام خطرے میں ہے!" کے نعرے لگانے سے کہیں ایسا نہ ہو کہ جب کبھی واقعی شیر آ ہی جائے اور اسلام کو حقیقی خطرہ درپیش ہو تو عوام اسے بھی مذاق سمجھ کر بیٹھے رہ جائیں اور کسی کی غیرتِ دینی جوش میں نہ آئے!------

تحریکِ پاکستان کے دوران بھی "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ" کے نعرے بڑے زور شور سے لگے تھے اور اُس وقت بھی بہت سے سادہ لوح اور نیک دل مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی امیدوں کے چراغ روشن ہو گئے تھے----- لیکن پھر مسلسل ۲۳ سال جس طرح ان نعروں کی مٹی پلید کی گئی اس سے خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنے لوگوں کے دلوں پر مایوسی اور ناامیدی کے کیسے کیسے اندھیارے پھیلے-----اب پھر اسی "رومانویت" کا دور دورہ ہے' لیکن انتخابات کے نتیجے میں جو کچھ ہو گا وہ کسے معلوم نہیں۔ ظاہر ہے کہ "اسلام اور کفر" کی اس ہوائی جنگ کی فتح کے ثمرات کی ساری فصل پرانے' پیشہ ور اور جدّی و پشتی سیاست دان کاٹیں گے-----اور ایک بار پھر مذہبی رومانویت کا غبارہ پھٹے گا اور لوگوں میں مایوسی و بددلی کی عام لہر پھیلے گی-----اور اس بار اس "DIS-ILLUSIONMENT" کی پوری ذمہ داری جماعت اسلامی پر عائد ہو گی۔

دوسری طرف جمعیت علماء اسلام کی تمام خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ہماری رائے میں اس کی موجودہ حکمتِ عملی آخر کار اسلام کے لئے مفید ثابت ہو گی-----اس لئے کہ اس وقت اصل صورتحال یہ ہے کہ ہمارے ملک میں کچھ لوگوں نے طبقاتی شعور فی الواقع پیدا کر دیا ہے اور کسانوں' مزدوروں اور دوسرے محنت کش طبقات میں یہ احساس بیدار ہو گیا ہے کہ وہ مظلوم و مجبور ہیں اور ان کا استحصال ہو تا رہا ہے----چنانچہ وہ اپنے معاشی حقوق کی بازیافت کے لئے منظم جدّوجہد کا آغاز کر چکے ہیں----اور ملک میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو ان کو مسلسل ذہنی و فکری غذا بھی دے رہے ہیں اور اس جدّوجہد میں ان کے ساتھ تعاون بھی کر رہے ہیں۔ جب تک یہ صورت پیدا نہیں ہوئی تھی اور کسان اور مزدور "قسمت" پر راضی و شاکر تھے بات مختلف تھی' لیکن اب صورتحال بالکل تبدیل ہو چکی ہے اور پسے ہوئے طبقات اپنا حق وصول کرنے کے لئے عملاً اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اس مرحلے پر "سرمایہ داری" بھی اپنے تحفظ کے لئے ہر ممکن چال چل

لہٰذا

اگر خدانخواستہ صورت یہ ہوتی کہ ملک کے تمام مذہبی طبقات مجتمع ہو کر سرمایہ داری کے پشت پناہ بن جاتے تو یہ ہمارے نزدیک نہایت خطرناک صورتحال ہوتی' اس لئے کہ اس صورت میں عوامی طاقتوں کا سیلاب سرمایہ داری کے ساتھ ساتھ دین و مذہب کو بھی بہا کر لے جاتا------!!

لیکن "جمعیت علماء اسلام" کے اپنے آپ کو غرباء کی صف میں کھڑا کر لینے سے بحمد اللہ یہ خطرہ دور ہو گیا ہے------- اب ان شاء اللہ جنگ اسلام اور کفر کی نہیں رہے گی بلکہ سیاسی گروہوں کی باہمی جنگِ اقتدار ہو گی' یا ایک نظریۂ سیاست و معیشت کا دوسرے نظریۂ سیاست و معیشت سے مقابلہ ہو گا!!

ہم اپنے بارے میں وضاحت سے عرض کئے دیتے ہیں کہ ہمیں اصل دلچسپی صرف اسلام اور اس کی نشأۃِ ثانیہ سے ہے۔ بین الاقوامی سیاست کے اتار چڑھاؤ بھی ہمارے سامنے ہیں' بین الاسلامی اور بین العرب سیاست کے بارے میں بھی ہمارا ایک نقطۂ نظر ہے اور ملکی سیاست کے پیچ و خم سے بھی ہم بحمد اللہ بالکل ناآشنا نہیں---- لیکن ہم علیٰ وجہ البصیرت جانتے ہیں کہ ان چیزوں کا فی الوقت اسلام اور اس کی نشأۃ ثانیہ اور دین اور اس کے احیاء سے کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا ان تمام چیزوں سے نظری دلچسپی رکھنے کے باوجود ان میں سے کسی میں کسی پہلو سے کوئی عملی حصہ لینے پر ہماری طبیعت کسی طرح مائل نہیں ہوتی۔ ہم اپنی مہلتِ عمر اور صلاحیتوں کی حقیر سی پونجی کو اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے عظیم الشان کام کے کسی ایک چھوٹے سے گوشے کی خدمت میں صرف کر دینے ہی کو اصل کامیابی سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق ارزانی عطا فرمائے۔ آمین

وَ آخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۝۝

روایت شکن

تاریخ ساز

مسلسل اشاعت کے 32 درخشاں سال

طلباء کا مقبول اور

سب سے زیادہ پڑھا جانیوالا ماہنامہ

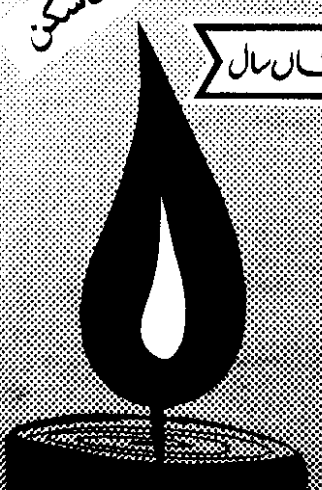

ہمقدم

اب مستقبل اسلام کا ہے

• طلباء کے مستقبل کا رہنما

- آج کا طالب علم مایوس کیوں؟ • مغرب کا تہذیبی و سیاسی تسلط؟
- تزکیۂ نفس؟ • نوجوانوں کو درپیش چیلنجز؟
- تعلیمی اداروں میں امن کیسے؟ • تعلیمی اداروں میں بگاڑ کا ذمہ دار کون؟
- اسلامی زندگی کی تشکیل نو؟ • طلباء کے اجتماعی مسائل؟
- عالم اسلام، احیائے اسلام اور اسلامی تحریکات کا مستقبل؟

جرأتوں اور جذبوں، عظمتوں اور عزیمتوں کے تذکروں اور
نئے انعامی سلسلوں سے مزین —— **ہمقدم**

۱۔اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور، پاکستان۔ فون ۷۵۸۷۱۲۴، ۷۵۸۸۴۸۸۔ فیکس ۷۵۷۲۳۱۰

KHALID TRADERS

IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS &
SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS,
FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE

AUTHORIZED AGENTS
NTN
BEARINGS

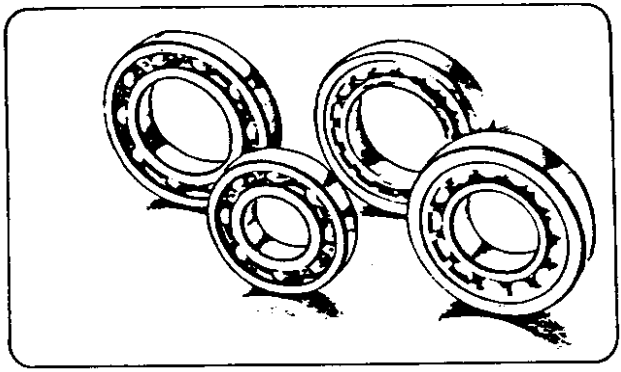

PLEASE CONTACT

TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734776

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65,
Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : **(Opening Shortly)**	Amin Arcade 42, Brandreth Road, Lahore-54000 Ph : 54169
GUJRANWALA :	1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

Reg. No. L 7360
Vol. 45 No. 6
June, 1996

Quarterly Journal of the Qur'an Academy

The Qur'anic Horizons

Patron: Dr. Israr Ahmad

April-June '96 issue is under print!

Contents

- The Spirit of Revolution (Editorial)
- The Objective and Goal of Muhammad's Prophethood (SAAWS) - II (By Dr. Israr Ahmad)
- The Qur'an and *Riba* (By Dr. Sayyid Tahir)
- Islamic Revolutionary Thought and its Decline (By Dr. Israr Ahmad)
- In Search of Knowledge (By Farhan Shamsi)

Markazi Anjuman Khuddam-ul-Qur'an Lahore